ظہوری

مطالعہ پاکستان

(سائنس، کامرس، جنرل گروپ)

برائے امتحانات

(SECONDARY & HIGHER SECONDARY CLASSES)
B.A, B.SC, B.B.A, B.C.S, B.C.I.T
B.COM, B.S, P.C.S, B.E, B. ARCH.

معہ

اہم رہنما سوالات

ترتیب وتالیف

شیخ آصف اقبال ظہوری

لیکچرار

پاکستان اسٹڈیز

گورنمنٹ ڈگری کالج اینڈ پوسٹ گریجویٹ سینٹر

یونٹ نمبر 11 لطیف آباد حیدر آباد

0333-2653460

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	برصغیر پاک و ہند میں مسلم معاشرے کی تشکیل اور ارتقاء	۵
۲	ہندو اور مسلم معاشروں کا تقابلی جائزہ	
۳	دوقومی نظریہ کی تعریف	۹
۴	قائداعظم اور نظریہ پاکستان	۱۲
۵	مسلم معاشرے کی تجدیدی اصلاحی اور تعلیمی تحریکات	۱۵
۶	مسلمانوں کے اقتدار کا زوال	۲۲
۷	برصغیر پاک و ہند میں برطانوی حکومت کا قیام	۲۴
۸	1857ء کی جنگ آزادی کے اسباب و نتائج	۲۵
۹	جنگ کے بعد مسلمانوں کے حالات	۲۷
۱۰	1857ء کے بعد سرسید احمد خان کی خدمات	۲۸
۱۱	تحریک علی گڑھ اور اسکے تعلیمی و سیاسی اثرات	۳۱
۱۲	انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885ء	۳۳
۱۳	تقسیم بنگال کے اسباب و نتائج	۳۴
۱۴	شملہ وفد کی تشکیل، مطالبات اور اہمیت	۳۵
۱۵	آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 1906ء	۳۵
۱۶	منٹو مورلی ریفارمز 1909ء	۳۶
۱۷	میثاقِ لکھنؤ	۳۷
۱۸	گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء	۳۸
۱۹	رولٹ ایکٹ 1919ء	۳۹
۲۰	تحریک خلافت کے مقاصد اور برصغیر کی سیاست میں اس کا کردار	۳۹
۲۱	سائمن کمیشن	۴۰
۲۲	نہرو رپورٹ 1928 اور اسکے نتائج	۴۱
۲۳	قائدِاعظم کے چودہ نکات اور ان کی اہمیت	۴۱
۲۴	علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد اور اسکی تاریخ اہمیت 1930ء	۴۲
۲۵	گول میز کانفرنسیں 32-1930ء	۴۳
۲۶	قراردادِ پاکستان کے اغراض و مقاصد کا تفصیلی جائزہ	۴۵
۲۷	1942ء کرپس مشن کی سفارشات اور ہندوؤں کا ردعمل	۴۶
۲۸	کیبنٹ مشن 1946	۴۷

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

۲۹ 3 جون کا منصوبہ (1947ء) ۴۸
۳۰ قانون آزادی ہند 1947ء ۴۸
۳۱ پاکستان ناگزیر تھا؟ ۴۹
۳۲ تحریک پاکستان کا پس منظر ۵۲
۳۳ قیام پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار ۵۵
۳۴ تحریک پاکستان میں صوبوں کا کردار ۵۷
۳۵ قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد ۵۹
۳۶ بابائے قوم قائداعظم (1876ء،1948ء) ۶۰
۳۷ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی مسائل اور مشکلات ۶۱
۳۸ قرارداد مقاصد 1949ء ۶۲
۳۹ 1956ء کا آئین ۶۳
۴۰ 1962ء کا آئین ۶۵
۴۱ 1973ء کا آئین ۶۷
۴۲ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت ۷۳
۴۳ پاکستان کا طبعی خدوخال ۷۴
۴۴ پاکستان کے معاشی مسائل ۷۵
۴۵ آبادی میں بلند شرح سے اضافے کے معیشت پاکستان پر اثرات و نتائج ۷۷
۴۶ معیشت پاکستان کے زراعت کی اہمیت ۷۹
۴۷ پاکستان کے خارجہ تعلقات ۸۱
۴۸ پاکستان کا ثقافتی ورثہ ۸۲

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

اقتباسات

مطالعہ پاکستان برائے نہم و دہم جماعت، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ (جامشورو)

مطالعہ پاکستان برائے گیارہویں وبارہویں جماعت، سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ (جامشورو)

مطالعہ پاکستان برائے نہم و دہم جماعت، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ (لاہور)

مطالعہ پاکستان برائے گیارہویں وبارہویں جماعت، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ (لاہور)

تاریخ پاک و ہند (غزالی اکیڈمی)......مطالعہ پاکستان (پاکستان بک سینٹر)......مطالعہ پاکستان (نیشنل بک فاونڈیشن)

مطالعہ پاکستان (علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)......advanced study on Pakistan Affairs(Carvan Book House)

Pakistan Studies(Oxford University Press)

اہم رہنما سوالات برائے سالانہ امتحانات

ماڈل پیپر-۱

(۱) برصغیر میں مسلم معاشرے کی تشکیل میں مسلم فاتحین کا کردار اور معاشرے پر مرتب ہونے والے اسلامی اثرات پر بحث کریں؟

(۲) برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا زوال نیز برطانوی راج کے قیام و اسباب پر روشنی ڈالیں؟

(۳) تحریکِ علی گڑھ کے سیاسی و تعلیمی اثرات اور سرسید احمد خان کا تشکیلِ پاکستان میں کردار۔ نوٹ تحریر کریں؟

(۴) تحریکِ خلافت کے اسباب و نتائج نیز برصغیر کی سیاست پر مرتب ہونے والے اثرات تحریر کریں؟

(۵) مندرجہ ذیل میں سے کسی بھی تین پر نوٹ لکھیں؟

(۱) میثاقِ لکھنو۔ ۱۹۱۶

(۲) کیبنٹ مشن ۱۹۴۶

(۳) قراردادِ مقاصد

(۴) قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی مشکلات۔

ماڈل پیپر-۲

نظریہ پاکستان قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں بیان کریں؟

قراردادِ پاکستان کیا ہے؟ اور اس کی روشنی میں صوبائی خودمختاری کا تصور واضح کریں؟

مسلم لیگ کا قیام و تشکیل پاکستان میں اس کی جدوجہد نیز انڈین نیشنل کانگریس کی سیاسی سازشوں پر روشنی ڈالیں؟

پاکستان کی خارجہ پالیسی اور اس کے محلِ وقوع کی روشنی میں اہم عالمی طاقتوں سے تعلقات کی اہمیت بیان کریں؟

مندرجہ ذیل میں سے تین پر نوٹ لکھیں:

۱۹۷۳ کا آئین اور اسلامی دفعات۔

خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰

کرپس مشن ۱۹۴۲۔

قائدِ اعظم کے چودہ نکات ۱۹۲۸۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

اظہارِ تشکر

حضرت عارف معین شاہ ظہوری (سرپرست اعلیٰ ظہوریہ اکیڈمی)

سید مشتاق علی کاظمی صاحب (پرنسپل الفلاح کالج لطیف آباد)

پروفیسر احمد شمیم خان صاحب (سابق پرنسپل غزالی کالج لطیف آباد)

پروفیسر جناب عادل حیات صاحب (پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد)

پروفیسر جناب سید نورالدین صاحب (پرنسپل گورنمنٹ غزالی کالج حیدرآباد)

پروفیسر انور آرائیں صاحب (پرنسپل گورنمنٹ کالج حیدرآباد)

ڈاکٹر شعیب خان زئی صاحب (وائس پرنسپل، سیفی کالج لطیف آباد)

جناب رضوان راجپوت صاحب (ایڈمنسٹریٹر اسٹوڈنٹس ان صدر کیمپس)

جناب محمد فاضل شیخ (ایڈمنسٹریٹر سیفی کالج لطیف آباد)

جناب راشد علی راؤ (ایڈمنسٹریٹر اسٹوڈنٹس ان لطیف آباد)

جناب شہزاد عالم راؤ (وائس پرنسپل پیراگون ہائی اسکول)

جناب فدا حسین صاحب (الرحمان اکیڈمی)

پروفیسر انوار حیدر صاحب (پرنسپل سیفی کالج لطیف آباد)

پروفیسر جمیل انصاری صاحب (پرنسپل سیفی کالج صدر حیدرآباد)

پروفیسر ادریس قائم خانی (کاوکشی کیمبرج گرلز کالج)

پروفیسر [illegible] (پرنسپل سپیریر کالج G.O.R حیدرآباد)

جناب مسعود پرویز درانی (حیات گرلز کالج کینٹ حیدرآباد)

پروفیسر اختر ایوب صاحب

سید اعجاز علی شاہ (C.S.S Acedamy) لطیف آباد

عبدالعزیز صاحب (ابنِ سینا سینٹر لطیف آباد)

جناب معین الدین صاحب (پرنسپل بوسٹن ہاؤس پبلک اسکول)

سید ناصر کاظمی (الحراہائی اسکول آفندی ٹاؤن)

جناب شعیب بدر صاحب

ڈاکٹر اقبال واجد صاحب (الفرید [illegible]

ڈاکٹر مسرور احمد زئی صاحب

کرنل خالد خانزادہ (ہائیسٹ کالج [illegible]

میڈم تسلیم (ایکسیلیس کالج لطیف آباد)

میڈم افشاں رؤف (پرنسپل نزہت گرلز کالج)

میڈم نسیم پاٹولی (پرنسپل ڈگری گرلز کالج [illegible]

میڈم ظفر سلطانہ (پرنسپل شاہ لطیف گرلز کالج)

جناب جواد کریم بھٹی (پرنسپل پاکستان [illegible]

جناب سید نیئر عباس صاحب (پرنسپل [illegible]

سید فدا حسین صاحب (وائس پرنسپل پاکستان [illegible]

جناب سید حسن مہدی صاحب

Our Aim is to Defend the Ideological Boarders of Pakistan!

This Book is available in Urdu & English Languages (Sindhi Version Coming Soon)

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

برصغیر پاک و ہند میں مسلم معاشرے کی تشکیل اور ارتقاء

برصغیر پاک و ہند اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان زمانہ قدیم سے تعلقات قائم تھے کیونکہ ساحل سندھ اور جنوبی عرب کے ساحل کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے۔ اسی وجہ سے سندھ اور جنوبی عرب کے درمیان بحری راستوں سے تجارت قدیم زمانہ سے جاری و ساری ہے اور ایک لحاظ سے یہ ناگزیر بھی جا سکتی ہے کیونکہ ہندوستان میں مصالحہ جات اور دوسری اشیاء پیدا کی جاتی ہیں جن کی عرب ممالک اور جنوبی یورپ کے علاقوں میں بڑی طلب رہی ہے۔ سمندری سفر میں عرب ملاح ماہر تھے اس لئے وہ ساحل سندھ سے ہندوستانی سامان تجارت بڑی کامیابی سے جنوبی عرب کے علاقے یمن کے ساحل تک پہنچا دیتے تھے۔ جہاں سے خشکی کے راستے یہ سامان نہ صرف عرب کے مختلف علاقوں کی منڈیوں میں پہنچا دیا جاتا تھا بلکہ وہاں سے مصر اور جنوبی یورپ کی منڈیوں تک ہندوستانی برآمدات کی ترسیل ہوتی تھی۔ اس قسم کی تجارت طلوع اسلام کے بعد بھی جاری رہی۔ ہندوستانی سامان تجارت یمن کے راستے شام تک اور پھر شام کی بندرگاہوں کے ذریعہ یورپ تک بھیجنے کا سلسلہ چلتا رہا غرض اس طرح ہندوستان اور عرب کے درمیان بین الاقوامی تجارت ہوتی رہی۔ (عرب تاجر مغربی اشیاء تجارت یعنی یورپی برآمدات کو ہندوستان اور مشرقی ممالک کو بھی لے جاتے تھے)۔ یہ تجارت ایک طویل عرصہ بلکہ صدیوں تک چلتی رہی لیکن اس میں عرب تاجروں اور ملاحوں کی بالادستی اور اجارہ داری فروغ پاتی رہی اور ان کی تجارت کا حلقہ سیلون (سری لنکا) تک وسیع ہو گیا اور بہت سے عرب ملاح اور تاجر اس جزیرے میں مقیم ہو گئے اور وہیں مقامی عورتوں سے شادی بیاہ کر کے رہنے لگے۔ ان میں سے بعض تاجر اور ملاح جب فوت ہوئے تو ان کے ورثاء یعنی بیوائیں اور یتیم بچے جو صاف ظاہر ہے مسلمان تھے وہ اس بات کے خواہشمند ہوئے کہ انہیں ان کے اسلامی وطن یعنی علاقہ عرب میں جا کر بسنا چاہئے۔ اس مقصد سے ان لوگوں نے بصرہ کے عرب والی (گورنر) حجاج بن یوسف (661-714) کے پاس نیک خواہشات کے پیغامات اور تحفے تحائف بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا اور مقامی غیر مسلم حکمران نے بھی ان کی اس کام میں اعانت کی چونکہ وہ خود بھی ان بیواؤں اور یتیم بچوں کو ان کے آباؤ اجداد کے وطن بھیجنا اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا (ویسے بھی غیر مسلم حکمران نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد سیلون میں قیام پذیر ہو اور ان مرنے والے لوگوں کی بیوائیں اور یتیم بچے سیلون کے لوگوں کیلئے بوجھ بن جائیں)۔ غرض سیلون سے مسلمان بیواؤں اور مسلمان یتیم بچوں کا اخراج شروع ہوا اور سمندری راستے سے بے سہارا لوگ عربستان کی طرف کوچ کرنے لگے۔

اتفاق سے ایک بحری جہاز جس میں مسلمان بیوہ عورتیں اور یتیم بچے عربستان جا رہے تھے سمندری ہواؤں کے رخ بدلنے سے دیبل (بھنبھور بندرگاہ ضلع ٹھٹہ سندھ) کے قریب پہنچ گیا۔ اس جگہ ان کے جہاز کو مقامی غیر مسلموں نے لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا۔ مقامی غیر مسلم یا تو سندھ کے ہندو حکمران راجہ داہر کی بحری فوج سے تعلق رکھتے تھے یا بحری قزاق تھے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ راجہ داہر کے سرکاری اہلکار تھے کیونکہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو حکومت سندھ کے زندانوں میں قید کیا گیا تھا (صاف ظاہر ہے کہ سمندری ڈاکو اپنے پکڑے ہوئے لوگوں کو سرکاری قید خانے تک کسی صورت میں بھی پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے) کچھ عرب ملاح جو اس جہاز کے لوٹے جانے کے وقت بچ کر سمندری ساحل تک پہنچ گئے وہ طویل سفر کر کے بصرہ کے والی حجاج بن یوسف کے دربار میں پہنچ گئے اور اس گھمبیر واقعہ کی اطلاع حجاج کو دی۔ حجاج نے بڑے سخت الفاظ میں راجہ داہر کو خط لکھا اور مسلمان عورتوں اور یتیم بچوں کی باحفاظت واپسی اور ان سے لوٹے ہوئے مال و اسباب کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ راجہ داہر نے جواب میں یہ عذر پیش کیا کہ وہ اس واقعہ کا ذمہ دار نہیں کیونکہ یہ کاروائی بحری قزاقوں نے کی ہے جن پر اس کا عملی طور پر کوئی کنٹرول نہیں یہ ایک سفید جھوٹ تھا اس جواب سے حجاج بن یوسف مطمئن نہیں ہوا تھا۔

سندھ کی فتح: حجاج بن یوسف عرب کی تاریخ میں اپنی سخت مزاجی اور انتظامی معاملات میں بے انتہا سختی کیلئے مشہور ہے اس "نہ" کا لفظ سننے کی عادت نہ تھی۔ جب اس نے راجہ داہر کا نا قابل قبول جواب پڑھا تو اس کو اپنی بے عزتی اور مسلمانوں کی تحقیر سمجھتے ہوئے راجہ داہر کو اس کے جھوٹ کی سزا دینے کیلئے تیار ہو گیا۔ اسی زمانے میں مملکت اسلامیہ پر خلیفہ ولید بن عبدالملک کی حکمرانی تھی۔ حجاج نے ایک خط لکھ کر خلیفہ سے اجازت مانگی کہ وہ راجہ داہر کے خلاف فوجی کاروائی کی اجازت دے جس کیلئے سارے اخراجات خود حجاج بن یوسف ادا کریگا۔ خلیفہ بھی اس کام سے جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف کیا تھا خوش نہ تھا لہذا اس نے حجاج بن یوسف کو اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی حجاج نے اپنے داماد (اور بھتیجے) محمد بن قاسم کو طلب کیا جس کی اس وقت عمر صرف سترہ سال تھی اور وہ دنیا کی کسی بھی فوج کا سب سے کم عمر فوجی سپہ سالار (جرنیل) تھا سندھ پر حملہ کیلئے تیار کیا اور اس کی قیادت میں 6000 گھڑسواروں کا لشکر براستہ شیراز (ایران) و مکران (بلوچستان) دیبل کی طرف روانہ کیا (اور فوجی رسد و کمک سمندری راستے سے بھیجی جس میں پتھر پھینکنے والی مشینیں منجنیق بھی کثیر تعداد میں روانہ کیں)۔ یہ 712 عیسویں کا واقعہ ہے محمد بن قاسم اور اس کے لشکر نے راجہ داہر کو دو لڑائیوں میں شکست فاش دی (دوسری لڑائی میں راجہ داہر ہلاک ہو گیا) اور پورا سندھ (اور پنجاب کے علاقے ملتان تک) مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا جس پر پورے عدل و انصاف سے محمد بن قا

نے چند سال حکومت کی۔

دیگر مسلمان سلاطین کی آمد: جس وقت محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت بھی ہندوستانی (علاقہ سندھ و پنجاب) میں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی لیکن مالی اعتبار سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ غزنوی سلاطین (976-1186) اور ان کے جانشینوں (غوری سلاطین) نے جو وسط ایشیاء سے تعلق رکھتے تھے ہندوستان کے علاقے میں بڑی کامیابی سے حکومت کی۔ یہی وہ علاقہ ہے جو بعد میں مملکت پاکستان کے طور پر دنیا کے نقشہ پر ابھرا (ماسوا بنگال/ بنگلہ دیش)۔ تیرھویں صدی کے ابتدائی زمانے میں اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے دہلی تک جا پہنچا اور مسلم سلاطین نے جو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے دہلی پر حکومت کی (وہ سارے ہندوستان کے حکمران سمجھے جاتے تھے)۔ 1206-1526 تک کا دور دہلی سلاطین کا دور حکومت کہلایا۔ پھر وسط ایشیا سے آنے والے ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کر کے مقامی مسلم حکمران ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست دی اور ابراہیم لودھی کے ہاتھیوں کے لشکر کو شکست فاش دے کر دہلی میں مغلیہ حکومت کی داغ بیل ڈالی جو 1526-1857 تک قائم رہی اور ہندوستان پر حکومت کرتی رہی۔

غزنوی حکمرانوں کے دور سے مفتوحہ ہند میں عربی کے بجائے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور رفتہ رفتہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں معاشی اور مذہبی ادارے قائم کیے جن کے لوگوں پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے ریاست کے معاملات اصول شریعت کے مطابق چلانے کا رواج ہوا اور وہ شریعت کو لازمی گردانے لگے۔ اس طرح کئی صدیوں تک شرعی قوانین کے مطابق مسلمان حکمران ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔

ہندو اور مسلم معاشروں کا تقابلی جائزہ

معاشرتی اختلافات: سماجی اعتبار سے ہندو اور مسلم معاشروں میں اختلاف کی وسیع خلیج حائل تھی۔ ہندو معاشرے کی بنیاد ورنا (رنگ) یا ذات کے تحت نظام پر قائم تھی جس میں ہندوؤں کے چار طبقات بنائے گئے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر جن میں برہمنوں کو سب سے اعلیٰ مقام دیا گیا تھا اور شودروں کو سب سے ادنیٰ قرار دیا گیا تھا اور اچھوت (جن کے لمس یا چھونے سے ناپاکی ہو جاتی ہو) قرار دیا گیا حالانکہ مرنے کے بعد دونوں کے جسم کیڑوں کیلئے یکساں بھرپور غذا فراہم کرتے ہیں۔ ذات کا ہندو فلسفہ ہندوؤں کی سماجی زندگی، عادات و اطوار اور نظریات پر پوری طرح مسلط کر دیا گیا تھا۔ ہندوؤں کو چاروں ذاتوں کے درمیان باہم شادیوں کی اجازت نہیں تھی۔ اور شادی اور موت کے رسم و رواج میں بھی زبردست طبقاتی فرق نمایاں تھا۔ بالائی طبقے کے علاوہ باقی طبقے برادری باہر یا وحشی تصور کیے جاتے تھے اس طرح فطری حالات میں ہندو سماج میں مذہبی رواداری اور مساوات کا سرے سے وجود ہی نہ تھا اور اسکے بنیادی اصول انسانیت کے فلسفے کے منافی تھے۔ ہندو دھرم کے ہر طبقے کے لئے تقاریب، موت اور شادی کے رسم و رواج اور روایات منفرد اور علیحدہ نوعیت کے تھے۔ ایک طبقہ سے کسی فرد کی دوسرے طبقے میں تبدیلی ناممکن تھی یعنی ایک طبقہ کا فرد دوسرے طبقہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح ذات کو ہندو دھرم میں ایک ناقابل تبدیلی فعل سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ انسانی مساوات کو تسلیم کرنے کیلئے نہ کبھی تیار تھا اور نہ آج اسے برداشت کر سکتا ہے۔ ایسی تبدیلی کو ہندومت کے پیروکار اور خاص کر برہمن ایک قسم کا مذہبی چیلنج سمجھتے ہیں اور اسے روکنے کیلئے ہتھیار اور قوت کے استعمال کو جائز سمجھتے ہیں (اسی بنیاد پر برہمن چھوٹ طبقات کے افراد پر ہر قسم کا ظلم جائز سمجھتے ہیں)۔

اس معاشرے کے مقابلے میں مسلم معاشرے میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین مخلوق یعنی اشرف المخلوقات سمجھا جاتا ہے اور انسانی مساوات کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں ہر فرد سے ایک خاص معیاری کردار، عمدہ اخلاقی عادات، فہم و فراست، رواداری اور بے لوث خلوص کی توقع کی جاتی ہے۔

مذہبی اختلافات: دولت اور طاقت کو حاصل کرنے کی انسانی خواہش منفی نوعیت کی حامل ہوتی ہے، دولت اور طاقت کے ناجائز حصول کی خاطر انسان کی حق تلفی اور استحصال کا ارتکاب کرتا ہے۔ ہندومت میں اس ناجائز خواہش کی تکمیل کیلئے ورنا کا اصول اپنایا گیا تھا اور خواہش کو باقاعدہ طور پر مذہبی تحفظ فراہم کیا گیا تھا جس کے تحت سماج کے اچھوت اور غیر اچھوت پاک اور ناپاک طبقات میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ دولت (لکشمی دیوی) اور طاقت (وشنو دیوتا) کی باقاعدہ پرستش کو رواج دیا گیا تھا۔ ایسا معاشرہ جس میں دولت اور طاقت کو سرمایہ حیات تصور کیا جائے اور انسانی عدم مساوات اور انسانی قربانی کو جائز سمجھا جائے تو وہ چاہے کتنا ہی مذہبی کیوں نہ ہو اس میں مذہب کی تعلیمات انسانوں سے نفرت کے اصول پر مبنی ہوتی ہیں۔

اسلام بطور مذہب توحید کی دعوت دیتا ہے جس میں ایک خدا کی پرستش اور انسانوں کو مساوات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سارے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور قانونی لحاظ سے برابر کے حقوق کا حقدار سمجھا جاتا ہے جس میں رنگ و نسل اور جغرافیائی لحاظ سے کوئی تفریق نہیں کی جاتی اور سب کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سیاسی اختلافات: امت مسلمہ کو ایک جسم کی حیثیت حاصل ہے اس میں امت کے سارے افراد کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں حکمرانوں کا احتساب کرنے اور سزا اور جزا کے تحت قوانین موجود ہیں جبکہ ہندو معاشرے میں دنیا کو "مایا" سمجھا جاتا ہے جس کے معنی سراب کے ہیں۔ اس نظریہ کے تحت ہندو دولت کی پرستش کی طرف راغب ہوتے ہیں اور برہمن حکمران سیاسی اقتدار اور فیصلہ سازی کے سارے اختیارات رکھتے ہیں وہ خدا سمجھے جاتے ہیں اور ان کے اعمال کا کوئی احتساب نہیں کیا جاتا۔

تصوراتی اختلافات: ہندو مذہب کے پیروکاروں کیلئے جنگ دامن ذاتی تحفظ وانا کیلئے ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد چھوٹی ذات کے ہندوؤں کو غلام بنا کر ان کے بنیادی حقوق غصب کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح معاشرے کے ایک بڑے حصہ کا استحصال جائز سمجھا جاتا ہے۔ (جو مہذب معاشرہ کے تصور کے قطعی منافی ہے)
اس کے برخلاف مسلم معاشرے میں جنگ وامن کا انحصار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر منحصر ہوتا ہے اور معاشرے کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا قیام ہوتا ہے جس میں بنی نوع انسان کا غلامی سے نجات دلانا، بنیادی حقوق فراہم کرنا، سماجی وقانونی مساوات کو یقینی بنانا، سب کے ساتھ انصاف کرنا وغیرہ جیسے نیک اوصاف کو فروغ دیا جاتا ہے تا کہ معاشرہ کے مقتدر اور طاقتور افراد معاشرے کے کمزور اور ناتواں افراد کا استحصال نہ کر سکیں۔ اس طرح اسلامی معاشرہ کا بنیادی تصور انسان دوستی اور نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور اسکی نوعیت فلاحی ہوتی ہے جب کہ ہندو معاشرہ ظلم وتشدد، حق تلفی اور غرباء کے استحصال کو جائز خیال کرتا ہے۔

ثقافتی اختلافات: ہندو معاشرہ اور اسلامی معاشرے دو انتہائی مختلف ثقافتوں کے حامل ہیں۔ ان کے ڈھانچے اور خدوخال بنیادی طور پر ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ انکے پیروکار کبھی مشترکہ معاشرہ تشکیل نہیں دے سکتے۔ ان کے رہن سہن کے طریقے مذہبی عقیدے، رسم ورواج اور روایات میں مشرق سے مغرب تک کا فاصلہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی عمومی زبان اردو ہے اور اس کا ثقافتی ورثہ اور ادب ہندوؤں کی زبان ہندی اور سنسکرت ادب سے بالکل جداگانہ ہے۔ اردو میں کثرت سے فارسی اور عربی کے الفاظ موجود ہیں جب کہ ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے۔
ہندوؤں اور مسلمانوں کے فلسفے اور ان کی تاریخوں میں بھی بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ مسلمان فاتحین کو ہندو وحشی حملہ آور قرار دیتے ہیں۔ جب ہندو اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو وہ کوٹلیا (ارتھ شاستر کے مصنف) سے رجوع کرتے ہیں جب کہ مسلمان الفارابی کو آواز دیتے ہیں۔ دونوں معاشروں کا فلسفہ حیات اور ان کا فلسفیانہ ماضی کا ماحول اس قدر متضاد ہے کہ ہندو مسلمان کسی مشترکہ سماجی یا گروہی پرچم یا چھتری کے نیچے باہم یکجا نہیں ہو سکتے اور وہ ایک معاشرتی وحدانیت سے وابستہ نہیں ہو سکتے۔ در حقیقت نہ صرف ہندو اور مسلم معاشرے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں بلکہ ان کی ثقافتیں اور تہذیبیں بھی جداگانہ ہیں۔

ہندو معاشرے پر اسلام کے اثرات: ہندو معاشرہ صدیوں سے ذات پات کے فرسودہ نظام کے تحت چل رہا ہے جس میں ایک طاقتور اعلیٰ ذاتی طبقہ جو برہمن کہلاتا ہے پوری طرح اقتدار پر قابض ہے۔ برہمن چھوٹی ذاتوں کے ہندوؤں کا استحصال کر رہا ہے اور ان کے بنیادی انسانی حقوق کو غصب کئے ہوئے ہے یہی وجہ ہے کہ اس معاشرہ کی شان و شوکت اور افادیت پوری طرح ختم ہو چکی ہے۔ اس تنگ نظری پر مبنی معاشرے کو نہ آج پسند کیا جاتا ہے نہ ماضی میں نچلی ذات کے ہندوؤں کیلئے قابل قبول تھا نہ اس وجہ سے معاشرہ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے مستقل بنیادوں پر چار ذیلی معاشروں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہندو معاشرتی اور فوجی اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ بڑی آسانی سے مغلوب ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کی ایک طاقتور تحریک کے بندھن میں باندھ دیا اور کمزوروں کو ہر قسم کی بدعنوانیوں اور استحصال سے نجات دلائی۔ اسلام نے مہذب دنیا میں ایک مظبوط اخلاقی اور دانشورانہ قیادت کی داغ بیل رکھی۔ مسلمانوں کے اس اعلیٰ معاشرتی نظام اور اعلیٰ اوصاف کے ہندوؤں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور ہندو معاشرہ میں اصلاح کا پہلو پیدا ہوا۔ انکے معاشرتی کردار میں زبردست تبدیلی رونما ہوئی اور پہلی بار صدیوں کے بعد ہندوؤں میں انسانی مساوات کا تصور پیدا ہوا۔

مذہب پر اثرات: اسلام کا ہندو دھرم پر خاطر خواہ اثر پڑا اور اس کے دوررس نتائج نکلے۔ قرونِ وسطیٰ کی ہندو دینیت، بھگتی تحریک کا فروغ، ذات پات کے بندھنوں کا کمزور پڑنا سب اسلام کے واضح اثرات کا نتیجہ تھے۔ انسانیت سوز مظالم (انسانی قربانی، ستی کی رسم اور مذہبی بھجن وغیرہ سننے پر نچلی ذات کے لوگوں کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کا قاتلانہ طریقہ وغیرہ) کا بھی خاتمہ ہوا۔ ہندو مذہب کے پیچیدہ عقائد، تصورات، فرسودہ رسم ورواج کے مقابلے میں اسلامی عقیدہ، طرز معاشرت، انسانی بھائی چارہ قانونی ومعاشرتی مساوات وغیرہ پر مبنی انسانی سلوک اور اس کی واضح تعلیمات نے ہندوؤں کو نہ صرف اس طرف راغب کیا بلکہ خود ہندو دھرم کے سخت اور ظالمانہ رویہ کی خاطر خواہ اصلاح ہوئی۔

اسلامی تصورات سے ہندوؤں کے اکابرین، زعماء، مذہبی پیشوا اور مفکرین بھی بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی غیر انسانی تنگ نظری کو دور کر کے اس کی جگہ محبت، بھ

چارے، مساوات اور خدا کی وحدانیت کے اسلامی اصولوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ (اگر چہ کہ وہ کثیر المعبودیت اور بت پرستی اور ذات پات کی غیر انسانی تفریق
نہ کر سکے)۔ اس اسلامی اثر نے بھگتی تحریک کی راہ ہموار کی جس سے اسلامی اعلیٰ انسانی اوصاف اور تعلیمات کے مطابق ہندو دھرم کے عقائد میں اصلاح کا کام شروع
تحریک کو ماننے والوں نے مذاہب کے تخصص، خدا کی وحدانیت، انسانی بھائی چارے اور پیدائش کے بجائے عمل کی بنیاد پر عزت کے اصولوں کی ترویج کی۔ انہوں
پات کی تفریق اور طبقاتی نفرت رقابتوں، تعصبات اور پجاریوں (برہمنوں) کی بالادستی کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا اور کچھ ایسا طریقہ اختیار کیا کہ عام لوگوں
پیدا کیا جائے کہ ہندو مذہب اور اسلام کی بنیادیں دراصل ہم آہنگ ہیں مثلاً انہوں نے اپنے بھجنوں اور مذہبی گیتوں میں رام اور رحیم، کیشو اور کریم، کعبہ اور کلیسا
پران کا ایک ساتھ ذکر کرنا شروع کر دیا۔ آٹھویں تا سولہویں صدی کے دورانیہ میں بھگتی تحریک کو کافی فروغ حاصل ہوا اور ہندوؤں کی بڑی تعداد بھگتی تحریک سے بڑی
ہوئی اس تحریک کے رہنماؤں میں شنکر اچاریہ، رامانج، رامانند چیتنیہ، نام دیو، کبیر اور بابا گرونانک (سکھ مذہب کے بانی) نے خاص طور پر بڑی شہرت پائی۔

سیاسی وسماجی نظام پر اثرات: جب مسلمان برصغیر میں فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئے تو اس وقت ہندوؤں کا سابقہ ایک ایسی قوم سے پڑا جس کا سماجی نظام
ذات پات کے نظام سے بالکل متضاد اور مختلف تھا۔ ہندوؤں (خاص کر برہمنوں) کو یہ نظام ان کے اقتدار کے خاتمہ کا باعث نظر آیا اس لئے انہوں نے مسلمانوں
نظام کی جس کی بنیاد فطرت اسلام تھی سخت مخالفت کی اور ہر طرح سے اس کی تبلیغ کی مزاحمت کی لیکن یہ مزاحمت صرف اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں ہی تک محدود تھی
مشتمل تھا جنہوں نے اپنی بالادستی اور اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے ایک انتہائی پیچیدہ غیر انسانی ظالمانہ ذات پات کا نظام قائم کر رکھا تھا اور جبر وتقدس پر مبنی سیاسی ڈھانچہ
تھا جس سے چھوٹی ذات کے سارے ہندو نالاں تھے جن کا بری طرح استحصال ہو رہا تھا اور جن کے انسانی حقوق کو غصب کر لیا گیا تھا۔ غالباً کسی نجات دہندہ کے منتظر
جیسے ہی انہیں دعوت اسلام ملی وہ اسلام کی طرف راغب ہو گئے۔ لیکن برہمنوں نے سر توڑ کوشش کر کے بڑی تعداد میں چھوٹی ذات کے ہندوؤں کو مشرف با اسلام نہیں
اور انہیں مسلمانوں سے ہمیشہ علیحدہ اور دور رکھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں دو مختلف اور متضاد سماجی نظام ایک دوسرے کے مدمقابل زندگی گزارتے رہے اور
کی آبادی مستقل طور پر دو طاقتور اکائیوں کی آماجگاہ بنی رہی اور یہی دو متصادم سماجی نظام تھے جس سے ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی ابتداء ہوئی۔
ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی گرفت مظبوط تھی اس دور میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ بڑے پیمانہ پر جاری رہی۔ اسلامی نظام کے گہرے نقوش مقامی آبادی پر مرتب ہو
جنگی تربیت کو فروغ حاصل ہوا۔ جنگی حکمت عملیوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں متعارف ہوئیں اور نئے نئے ہتھیار خاص کر آتشیں اسلحہ، بندوقیں اور توپیں وغیرہ فوجی اغراض
استعمال ہونے لگیں۔ پوری فوجی تنظیم، فوجی تربیت کے نظام اور نئے ہتھیاروں کے استعمال سے ملک کے عسکری نظام میں انقلابی ترقی ہوئی۔ تلوار، برچھے اور کلہاڑے
وغیرہ کی جگہ جدید اسلحہ سے لیس مسلح فوج مسلم حکمرانوں کی طاقت کا سرچشمہ بنی اور ایک بنیادی دفاعی ادارے کی حیثیت سے ابھری۔

تہذیب وثقافت پر اثرات: ہندوستان میں رائج ہندو ذات پات کے نظام پر اسلامی تہذیب وثقافت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوؤں کو آزادی خیال
کے اظہار کا موقع ملا۔ وہ انسانی عظمت، عالمی بھائی چارہ اور یکساں سماجی حقوق کے نظریہ سے واقف ہوئے۔ اسلام کے ان سنہری اصولوں سے واقفیت ہونے
ثقافت میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ ہندوؤں کے ذات پات پر مبنی تعلیمی نظام میں صرف برہمنوں کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل تھے اور نچلی ذات
ہندوؤں کو عملی طور پر تعلیم سے محروم رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو عام تعلیم کا تحفہ دیا جس کا ان کے پاس پہلے کوئی تصور نہ تھا۔ اس کے علاوہ انسانی قربانی اور ستی کی
مسلمانوں نے حوصلہ شکنی کی اور ہندوؤں پر یہ بات واضح کی کہ سزا و جزا کا تعلق انسان کے اچھے اور برے اعمال سے ہوتا ہے اور اس کا انحصار مخصوص طبقہ میں پیدائش پر نہیں
یعنی یہ سوچ غلط ہے کہ اعلیٰ ذات میں پیدائش ہی نجات کی ضامن ہے اور یہ کہ چھوٹی ذاتوں میں پیدا ہونے والے نجات سے محروم رہیں گے جیسا کہ ہندو پنڈتوں نے مشہور
رکھا تھا۔ غرض اسلامی نظریات اور تصورات رفتہ رفتہ ہندو مذہب کے نظریات اور تصورات پر حاوی ہوتے گئے اور نچلی ذات کے ہندو برہمنوں کی عائد کردہ مصنوعی مذہبی
بندشوں کی اصلیت سے واقف ہو گئے اور ان کو جھوٹ اور غلط سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔
ہندوستانیوں کے لباس، خوراک، اجتماعات، شادی بیاہ کی تقاریب، عدالتی نظام وغیرہ پر بھی اسلامی ثقافت کے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ مثلاً لباس میں
اور شلوار کو شمالی ہند کے ہندوؤں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جو خالصتاً اسلامی طرز کے لباس ہیں اس کے علاوہ ہندوؤں میں شکار کرنے، پولو کھیلنے اور باز کے استعمال
شکار کرنے اور دوسرے متفرق کھیل وغیرہ بھی اسلامی نوعیت کی حامل مصروفیات تھیں جو ہندوؤں میں بڑی مقبول ثابت ہوئیں۔ فن باغبانی میں ایک قسم کی یکسانیت، توازن
اس کے نت نئے طریقے بھی اسلام ہی نے متعارف کرائے۔
مسلمان ہندوؤں سے بہتر سماجی ومعاشی حیثیت کے حامل تھے انہیں دیکھ کر ہندوؤں میں نئے نئے فیشن متعارف ہوئے۔ مسلمانوں میں شاندار قسم کی دعوتوں کا اہتمام

تھا جن میں سو سے زیادہ کھانے دستر خوانوں پر چنے جاتے تھے ابوالفضل نے مسلمانوں کے متعارف کئے ہوئے کھانوں کی ایک فہرست اپنی تصنیف آئین اکبری میں دی ہے ان میں سے چند مشہور مغل دور کے کھانے مثلاً پلاؤ، قورمہ، شیرمال، زردہ، بریانی اور مختلف اقسام کے کباب آج بھی بے حد مرغوب کھانوں میں شمار ہوتے ہیں

زبان اور ادب پر اثرات: ہندوستان میں جو مسلمان فاتحین پہلے داخل ہوئے وہ عربی بولتے تھے۔ ان کے بعد ترکی بولنے والے اور پھر فارسی بولنے والے یکے بعد دیگرے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ لہذا بعد میں مسلمانوں میں عربی زبانی مذہبی تعلیمات کیلئے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ فارسی زبان کو درباری اور عدالتی زبان بننے کا موقع ملا۔ اس لئے سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند ہندو اور مسلمان فارسی زبان سیکھنے لگے لیکن پھر بھی فارسی عمومی زبان کا درجہ حاصل نہ کر سکی مقامی ہندوستانی زبان برج بھاشا، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان کی تخلیق عمل میں آئی جو اردو کہلائی۔ اسلام کے اثرات مقامی زبانوں پر بھی مرتب ہوئے اور ان زبانوں کو بھی بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ تیرہویں صدی کے اختتام تک ہندوؤں کی قدیم اور مذہبی زبان سنسکرت بہت ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن دوسری زبانوں نے مسلم دور حکومت کی خوش حالی اور امن و امان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کافی ترقی کی اور ہر زبان میں ادبی سرگرمیاں عروج تک پہنچ گئیں۔ پورے ملک میں مقامی ادب نے تیزی سے فروغ پانا شروع کیا۔ بنگالی، مراٹھی، سندھی اور پنجابی میں بڑے پیمانے پر تصنیف و تالیف کا کام ہوا۔

فنون لطیفہ اور فن تعمیرات پر اثرات: مسلمانوں نے ہندوستانی فنون لطیفہ اور فن تعمیر پر بڑے گہرے اثرات مرتب کئے۔ ہندو اور مسلم ماہر فنون اور ماہر تعمیرات کے درمیان روابط استوار ہوئے تو ہندوستان میں اس وقت مروجہ فنی طریقوں میں جدیدیت کا پہلو نمایاں ہوا اور ایک نئے فن تعمیر "ہندو اسلامی شعبہ فن تعمیر" (انڈو اسلامک اسکول آف آرکیٹیکچر) کی داغ بیل پڑی۔ اس سے یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ قدیم ہندوستانی فن تعمیر میں مظبوطی اور شان و شوکت کے ساتھ ساتھ اسلامی فن تعمیر کے اوصاف مثلاً کشادگی اور سادگی بھی شامل ہو گئے۔ (12) فتح پور سکری کے محلات، دہلی کا لال قلعہ اور تاج محل اس نئے فن تعمیر کے شاندار نمونے ہیں۔

دہلی کے مسلم سلاطین کے دور میں مسلمان فن آرائش نقش و نگار کو کافی ترقی ملی۔ ان کے زمانہ میں خطاطی اور عربی نقش و نگار کو بھی کافی ترقی ہوئی۔ انواع و اقسام کے بیل بوٹے اور ہندسی (جیومیٹری) اشکال تخلیق ہوئے اور کتابوں کی تزئین اور فن تعمیر میں ان کا استعمال کتابوں اور عمارتوں میں خوبصورتی کا اضافہ کرنے میں معاون ثابت ہوا خاص طور پر عربی خطاطی کی خوبصورتی میں بے حد اضافہ ہوا۔ مسلمانوں نے فن مصوری کو بھی بام عروج تک پہنچایا۔ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ شاہی محلات کی زیبائش و آرائش میں تصاویر کا بھی باقاعدہ استعمال ہوتا تھا۔ گو کہ صحیح عقائد پر عمل پیرا مسلمان اس کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے کہ مسلمان موسیقی کی ترویج میں حصہ لیں لیکن اس کے باوجود موسیقی اسلامی دور میں کافی فروغ پاتی رہی۔

تاریخ پر اثرات: ہندوستان میں تاریخ نویسی کا کوئی باقاعدہ طریقہ کار رائج نہ تھا جبکہ مسلمانوں میں تاریخ نویسی ابتدائے اسلام سے ہی رائج رہی اس لئے جب وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو تاریخ نویسی کو ہندوستان میں متعارف کرایا۔ ہندو دیومالاؤں کی داستانوں کی جگہ ایک منظم طریقہ سے حالات پر مبنی واقعات کو تاریخ کی شکل میں لکھنے کا طریقہ عام ہوا۔ ہندوؤں میں واقعات کی تاریخیں لکھنے کا رواج نہ تھا اس کے برخلاف عرب مسلمان جہاں جہاں بھی تاجرں اور فاتحین کی حیثیت سے دنیا کے مختلف ممالک میں پہنچے تو وہاں انہوں نے اہم حالات و واقعات اور سماجی تبدیلیوں کو باقاعدہ تاریخ وار قلمبند کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ اسی انداز میں جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو یہاں ظہور پذیر ہونے والے واقعات اور سماجی تبدیلیوں وغیرہ کے بارے میں خود نوشت سوانح عمری لکھنی شروع کر دیں جو اس دور کے تاریخی واقعات کے بارے میں مستند مواد فراہم کرتی ہیں (تزک بابری، تزک جہانگیری اور آئین اکبری وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں)۔ ہندو مصنفین نے بھی یہی طریقہ کار اپنا لیا اور تاریخی ادب میں د... مالائی داستانوں کے بجائے حقیقی واقعات کو قلمبند کرنے کا اسلوب اختیار کیا۔ فارسی زبان کے دوش بدوش ہندوؤں کی کلاسیکی زبان سنسکرت نے بھی مسلمانوں کے دور میں تر... کی۔

⟨☆⟩

دو قومی نظریہ کی تعریف

برصغیر کے مسلمانوں کے حوالہ سے دو قومی نظریہ دراصل امت مسلمہ کا وہ تصور ہے جس کی صراحت قرآن کریم میں موجود ہے۔

وکذلك جعلنكم امة وسطا لتكونو شهدآء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا ط

(قرآن البقرہ:143)

ہم نے تم (مسلمانوں) کو متوازن امت بنایا ہے تاکہ تم عالم انسانیت (کے اعمال) پر شاہد ہو اور (تمہاری مرکزیت کے امین) رسول تمہارے اعمال پر شاہد رہیں۔

Lecturer SHAIKH ZAHOOR IQBAL

علاوہ قرآن کریم میں یہ بھی ارشاد ہوا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ ط

(قرآن سورۃ آل عمران 110)

تم دنیا میں ایسی بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کیلئے میدان عمل میں لایا گیا ہے تم لوگوں کو مؤثر طور پر نیکی کی راہ دکھاتے ہو اور بدی کی راہ سے روکتے ہو اور یہ اس لئے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ذات پر حقیقی ایمان رکھتے ہو۔

مشہور مؤرخ البیرونی نے ہندو اور مسلم معاشرے کے فرق کو اس طرح بیان کیا "ہندو مسلمانوں سے ہر اعتبار سے مختلف ہے۔ ان (ہندوؤں) کے تمام تعصبات ان لوگوں کے خلاف ہے جو ان جیسے نہیں۔ یعنی تمام غیر ملکی (مسلمان) وہ انہیں ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلق کو گناہ سمجھتے ہیں خواہ باہمی شادیاں ہوں کسی بھی قسم کا تعلق یا ان کے ساتھ نشست و برخاست ہو یا کھانا پینا ہو کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کرنے سے وہ آلودہ ہو جائیں گے"

ہندو معاشرے نے صدیاں گزر جانے کے باوجود اپنا یہ کردار برقرار رکھا۔ ہندو مسلم معاشرہ ہمیشہ دو ایسی ندیوں کے مانند ہے جو کبھی بھی ایک دوسرے کو چھو تو لیتے تھے لیکن دوسرے میں کبھی ضم نہیں ہوئے بلکہ دونوں جداگانہ راستے برقرار رکھے۔

سرسید احمد خان ہندوستان میں وہ پہلے مفکر تھے جنہوں نے مسلمانوں کو 1867 میں ایک علیحدہ قوم قرار دیا تھا چنانچہ ہندوؤں نے انہیں سخت ناپسند کرنا شروع کیا حالانکہ ہندوؤں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے تھا کیونکہ سرسید احمد خان ہی وہ آدمی تھے جنہوں نے برطانوی حکمرانوں کے ذہن اس طرف رجوع کرائے کہ جب ہندوستانیوں کو ہندوستان کی انتظامیہ میں شامل نہیں کیا جائے گا 1857 کی بغاوت جیسے واقعات کا اعادہ ہوتا رہیگا۔

بیسویں صدی کی تیسویں دہائی کے اوائل میں علامہ محمد اقبال کی شمال مغربی ہند کے علاقوں پر مشتمل ریاست کی تجویز کو مسلم اکابرین اور زعماء نے قابل اعتناء سمجھا تھا مسلمانوں کے شعور کو بیدار کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے تھے تاہم اس دہائی کے وسط اور اواخر میں اقبال کی یہ تجویز مسلم ریاست کا رخ متعین کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

دو قومی نظریہ کی اہمیت

ہندوؤں اور مسلمانوں کے سوچنے کا انداز ان کی طرز ہائے زندگی باہم متصادم اور متضاد رہی ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے دو قومی نظریہ کی اہمیت مختصراً یوں بیان کی جاسکتی ہے:

۱۔ مسلمان اس حقیقت سے آشنا ہو چکے تھے کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں اب کسی نام نہاد ہندوستانی قومیت میں وہ خود کو ضم کر کے اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے تھے۔

۲۔ مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں ایک بڑے گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ گیارہ میں سے چار صوبوں میں ان کی اکثریت تھی، ان کی آبادی 90 ملین تھی جس کو صورت میں بھی اقلیت خیال کرنا درست نہ تھا۔

۳۔ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے اقتدار میں شراکت کا پورا پورا حق حاصل ہے اور وہ اقتدار میں اپنے حصے سے کسی صورت میں دستبردار ہونے کیلئے تیار نہ تھے۔

۔ مسلمانوں کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اقلیتوں کے تصور کے مطابق وہ ہرگز ایک گروہ نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی حصوں میں اپنا ارتکاز کیا تاکہ ان خطوں کو اپنی ایک آزاد مملکت کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

مسلمان اس بات پر متفق تھے کہ مغربی جمہوریت، ہندوستان کیلئے مناسب نہیں کیونکہ یہاں دو قومیں ہیں، جن میں سے ایک اکثریت اور دوسری اقلیت ہے۔ متحدہ ہندوستان کے قیام کی صورت میں اقتدار ہمیشہ کیلئے ہندوؤں کے ہاتھ میں چلا جاتا جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف تھا۔

Lecturer Shaikh Asif Zahoor

۶۔ مسلمانوں نے کانگریسی وزارتوں کے دور میں 1939-1937 سے سبق حاصل کرلیا تھا جس میں گاندھی کے فلسفے کے مطابق ودیا مندر
اور وارودھا اسکیم کی تعلیمی پالیسی نافذ کی گئی تھی۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ کی حیثیت دی گئی تھی اور اردو کی جگہ ہندی کو عدالتی زبان بنایا گیا تھا
اور اسے ترقی دینے کی پالیسی پر عمل کیا جارہا تھا۔ ایسے وقت مسلم لیگ نے ایک عوامی مہم چلائی اور ہندوستانی مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ
کانگریس مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور ان کے فکر و عمل کو تباہ کرنے کے درپے ہوگئی ہے اور خالصتاً ہندو تہذیب اور ہندو ثقافت کو فروغ
دینے اور اس کی تعمیر نو میں مصروف ہے۔

چنانچہ دو قومی نظریہ تحریک پاکستان کی بنیاد بن گیا جس نظریہ کے تحت تشکیل پاکستان کیلئے ہندوستانی مسلمانوں کو حکومت برطانیہ اور ہندو اکثریت کی طرف سے شدید مخالفت
کا سامنا کرنا پڑا اور قائداعظم کے شعور اور سخت محنت کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر تعداد ان کی حامی ہوگئی اور 14 اگست 1947 کو پاکستان عالم وجود میں آیا۔

دو قومی نظریہ کے ارتقاء اور تشکیل پاکستان کی صورتیں:

سندھ کے فاتح اول محمد بن قاسم کی آمد اور بعد ازاں شیخ احمد سرہندی (وفات 1626) شاہ ولی اللہ (وفات 1762) جمال الدین افغانی (وفات 1897) سرسید احمد خان
(وفات 1898) کے افکار اور اعمال کو تشکیل پاکستان کی بنیاد تصور کرتے ہیں لیکن 8 مارچ 1944 کو علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا
کہ جس دن پہلے مسلمانوں نے برصغیر میں قدم رکھا اور پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا۔ تقسیم برصغیر کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ناقابل تنسیخ
اختلافات کا ناگزیر نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

1879 میں مشہور پان اسلامزم کے مفکر جمال الدین افغانی نے ایک ایسی مسلم جمہوریت (ری پبلک) کے بارے میں اظہار خیال کیا جس میں وسط ایشیائی ریاستیں، افغانستان
اور برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقے شامل تھے۔ سرسید احمد خان وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس حقیقت پر زور دیا کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ براعظم ہے۔ ایک اور نامور
مصنف مولانا عبدالحلیم شرر نے 23 اگست 1890 کو اپنے ہفت وار رسالہ "مہذب" کے اداریے میں اپنے نظریات کا اظہار کیا تھا انہوں نے بیان کیا کہ "اب ایسا وقت
آگیا ہے کہ ایک قوم کی مذہبی رسومات دوسرے کے جذبات کو مجروح کئے بغیر ادا نہیں کی جاسکتیں اور نا ہی بے عزتی کو برداشت کرنے کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جب چیزیں اس نہج
پر پہنچ جائیں تو عقلمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کرکے تبادلہ آبادی کر دیا جائے"

اکتوبر 1917 کو سوشلسٹ انٹرنیشنل کی اسٹاک ہوم کانفرنس میں خیری برادران، ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر عبدالستار خیری نے ہندوستان کی
ہندو اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ اپریل 1920 میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی کے نام ایک کھلے خط میں یہ بات شائع کی کہ برصغیر کو ہندوؤں اور
مسلمانوں کے مابین تقسیم کر دیا جائے حتیٰ کہ اضلاع کی تقسیم کی بھی فہرست اس میں شامل تھی جو بنیادی طور پر پاکستان اور بنگلہ دیش کی موجودہ سرحدوں سے زیادہ مختلف نہیں
تھی۔ اس خط نے کچھ لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی کیونکہ بعدازاں اسے کتابچہ کی صورت میں بھی چھاپا گیا۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ دسمبر 1921 میں
احمد آباد میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں عظیم انقلابی شاعر حسرت موہانی نے مسلمانوں کے اس خوف کا حوالہ دیا کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے قیام کے
نتیجے میں ہندو اپنی عددی برتری استعمال کرکے ایک بڑی سیاسی طاقت بن جائیں گے اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ تین سال بعد 1924 میں انہوں نے
ہندوؤں کو مندرجہ ذیل تجاویز دیں۔

۱۔ مستقبل کی آزاد ریاست کی دو قومی (ہندو مسلم) حیثیت کا تعین۔

۲۔ مسلم اکثریتی صوبوں کی مسلم ریاستوں میں اور ہندو اکثریتی صوبوں کی ہندو ریاستوں میں تشکیل۔

۳۔ ان ریاستوں کو ملا کر ہندوستانی وفاق کی تشکیل اسے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل سپریم قومی حکومت کے تحت رکھنے کا منصوبہ۔

1923ء میں حکومت ہند نے شمال مغربی سرحدی کمیٹی کا تقرر کیا۔ اس کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ صوبہ سرحد کے اضلاع اور قبائلی علاقے کے مابین انتظامی تعلق اور
صوبہ سرحد کو پنجاب میں ضم کرنے کا معاملہ پر رپورٹ تیار کرے۔ اسلامی انجمن ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار گل خان نے کمیٹی کے روبرو 1924 میں بیان دیتے ہوئے
کہا "ہندو مسلم اتحاد کبھی حقیقت کا روپ نہیں اختیار کرسکتا اس کے بجائے ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین علیحدگی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ جنوب میں 23 کروڑ ہندو اور شمال
میں 3 کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو دے دیجئے اور آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے"

مولانا محمد علی نے بھی دو قومی نظریہ پر سختی سے یقین رکھتے تھے۔ اپنی ساری زندگی وہ دو قومی نظریہ ہندوستانی وفاق کی وکالت کرتے رہے جو دونوں قوموں کی باہم افہام و تفہیم

کی بنیاد پر قائم کیا جائے تاہم بعض اوقات وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تقسیم ہند ہی ایک واحد حل ہے۔ 1924 میں علی گڑھ میں اپنی تقریر میں انہوں نے کہا "اگر ہندو
نہیں ہوتا تو ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلمان ہندوستان میں تقسیم کرنا پڑے گا"
دسمبر 1929 میں آل انڈیا خلافت کانفرنس لاہور کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطاب میں نواب سر ذوالفقار علی خان نے کہا "ہندو
ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک ایسا علاقہ دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا اسے ایک صوبہ قرار دیا جائے۔ اس
ہندوستان میں بنگال کو اس طرح سے تقسیم کر دیا جانا چاہیے کہ مسلمانوں کی آبادی کا حصہ 80% ہو جائے۔ مسلمانوں کو خود بھی حقوق کے بجائے ایک علیحدہ مملکت
چاہیے"

29 دسمبر 1930 کو ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا "میں پنجاب، صوبہ سرحد
بلوچستان کو ایک ریاست میں مدغم دیکھنا چاہتا ہوں۔ خود مختار حکومت کے ہمراہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر، مجھے ایک متحدہ شمال مغربی ہندو
ریاست مسلمانوں کا کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتا ہے"

جنوری 1933 میں کیمبرج کے ایک طالب علم چوہدری رحمت علی نے "اب یا کبھی نہیں" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا اور پاکستان (پاک لوگوں کی سر
اصطلاح متعارف کرائی۔ یہ اصطلاح پنجاب، افغان صوبہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر اور سندھ کے پہلے حرف اور بلوچستان کے لفظ کے آخری حصے کو ملا کر
اس کتابچہ میں مصنف نے لکھا کہ متذکرہ بالا شمالی ہندوستان کے ان پانچ صوبوں میں چالیس ملین کی کل آبادی میں مسلمان 30 ملین ہیں جن کا مذہب، ثقافت
معاشرتی طرز زندگی اور معاشی نظام بنیادی طور پر بقیہ ہندوستان میں رہنے والے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان مسلمان بھائیوں کے نام پر جو پاکستان میں
انہوں نے ان مسلم اکثریتی اکائیوں کے علیحدہ وفاق کا مطالبہ کیا۔ رحمت علی نے پمفلٹ، ہینڈبل اور دیگر لٹریچر کی طباعت اشاعت اور تقسیم کیلئے پاکستان نیشنل موومنٹ
کی تھی اور پاکستان نام سے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا۔

چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 1937 میں آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم کی زیر قیادت مسلم لیگ کی تنظیم نو کا فریضہ انجام دیا اور دوقومی نظریہ کی بنیاد پر
فلسفہ رفتہ رفتہ کئی سیاست دانوں، مصنفین اور دانشوروں کی فکر و عمل کا حصہ بنتا گیا تاہم اس نظریہ کو باقاعدہ مطالبے کی شکل میں پیش کرنے میں لیگ کو مزید تین سال لگ
بر 1938 میں قائداعظم کی زیر صدارت سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کراچی میں ہوئی۔ اپنے صدارتی خطبے میں مسٹر جناح نے کانگریس پر مسلم لیگ کو تباہ کرنے کی کو
کا الزام لگایا کیونکہ وہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اس کا نتیجہ محض ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں
کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین جناب عبداللہ ہارون نے مسلمان ریاستوں کے ایک خود مختار وفاق کے ممکنہ قیام کی جانب اشارہ کیا۔ شیخ عبدالمجید نے خبردار کیا
دوسرا متبادل نہیں رہ جائے گا اور کوئی چیز کراچی سے گلگت تک کے مسلمانوں کو ان کے حق خودارادیت کی طرف پیش رفت کرنے سے نہیں روک سکے گی۔

قائداعظم اور نظریہ پاکستان

مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کے مطالبے کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا جو اقبال نے باقاعدہ شکل میں پیش کیا اور قائداعظم نے اسے سیاسی اور قانونی اصلاحات کی شکل
واضح کیا۔ قائداعظم نے اس نظریہ کو کانگریس کے اس نظریہ کے جواب میں پیش کیا جس کے مطابق ہندوؤں کا یہ بیان تھا کہ سارا ہندوستان مذہب، نسل زبان اور ذات
کی تفریق سے بالاتر ہو کر ایک واحد سیاسی قومیت ہے۔ قائداعظم کی توجہ ہندوستانی مسلمانوں کی اصل منزل کی طرف مرکوز تھی ان کی والہانہ با صلاحیت قیادت کے زیر
مسلمانان ہند نے ایک خود مختار ریاست کی منزل کی طرف پیش قدمی کی اور پاکستان کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ مارچ 1940 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں
کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنے نظریات یوں بیان فرمائے "مجھے بتایا گیا ہے کہ میں اسلام کو نقصان پہنچانے کا مرتکب ہوا ہوں کیونکہ اسلام جمہوریت کی تلقین کرتا ہے
جہاں تک مجھے اسلام کا علم ہے وہ ایسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا جو غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے۔ ہم کوئی ایسا نظام حکومت قبول نہیں کر
سکتے جس کی رو سے ایک غیر مسلم اکثریت تعداد کی بنا پر ہم مسلمانوں پر حکومت کرے اور ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے"

24 مارچ 1940 کو اپنے لاہور کے سالانہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی مشہور قرارداد منظور کی جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس میں ہندوستان
کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کو جو مسلم اکثریتی تھے انہیں خود مختار ریاستیں بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 22 مارچ 1940 کے افتتاحی اجلاس

مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان پیش کیا اور اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا۔

"یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے فرقوں اور فرقوں کے درمیان نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی ہی مان کر حل کرنا چاہئے اگر حکومت برطانیہ برصغیر کے باشندوں کیلئے یہ چاہتی ہے کہ ان کو امن اور خوشی حاصل ہو اور اس کی یہ خواہش واقعی مخلصانہ ہے تو اس کی صرف یہ ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے بڑی اقوام کیلئے جداگانہ قومی وطن منظور کیے جائیں۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ ذرا کوئی آنکھیں کھول کر دیکھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس نقشے کی رو سے جو برطانیوں نے بنایا ہے ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں مسلمانوں کو کم و بیش غلبہ حاصل ہے اور وہ اس کے باوجود حکومتیں چلا رہے ہیں کہ کانگریس کی اعلیٰ ہندو قیادت عدم تعاون اور سول نافرمانی کیلئے تیاریاں کر رہی ہے۔ قوم کی ہر تعریف کے مطابق مسلمان ایک قوم ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے پاس قومی وطن ہو ان کا اپنا ملک ہو اور اپنی ریاست ہو۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن و اتحاد سے رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنے تصورات اور مزاج کے مطابق اور جس طرح ہمارے خیال میں بہتر ہو روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ترقی کرے۔"

اس کے بعد جناح کی زندگی کا مقصد صرف یہ بن گیا کہ وہ لوگوں، برطانوی حکومت اور انڈین کانگریس کے قائدین کے سامنے دو قومی نظریہ اور تشریح کریں۔ دو قومی نظریہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے احمد آباد میں 28 دسمبر 1940 کو قائداعظم نے اعلان کیا "ہندوستان کو تقسیم کر دینا چاہئے تاکہ ہندو اور مسلمان دوستوں اور اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں اور اپنے مزاج کے مطابق زندگی بسر کریں"

دوبارہ 19 مارچ 1944 کو لاہور میں پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے اشتراکیت کو مسترد کرتے ہوئے کہا "میں کمیونسٹ پارٹی کو تنبیہ کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کا پیچھا چھوڑ دے اسلام ہمارا رہنما ہے اور ہماری زندگی کا مکمل ضابطہ ہے۔ ہمیں کسی ازم کی ضرورت نہیں ہے"

18 جون 1945 کو قائداعظم نے پشاور میں مسلمان طلباء سے کہا کہ انہیں قوم کو منظم کرنے میں مدد دینا چاہئے تاکہ یہ آزادی حاصل کر سکے اور اسلامی نظریات اور اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے انہوں نے کہا "پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم نظریہ ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل ہی نہیں کرنی ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔"

قائداعظم کے مطابق اسلامی مملکت پاکستان ایک مثالی سیکولر ریاست کی خصوصیات کی حامل ہوگی جو ہر شہری کو مذہبی آزادی کی ضمانت فراہم کرے گی اور مذہب یا نسل کے کسی امتیاز کے بغیر تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرے گی۔ 11 اگست 1947 کو آئین ساز اسمبلی سے صدارتی خطاب کے دوران قائداعظم نے فرمایا "اب آپ آزاد ہیں اپنے مندروں، مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں جا کر اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کریں آپ کا کسی مذہب، ذات یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں اس ریاست کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول کے تحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک واحد ریاست کے مساوی شہری ہیں میرا خیال ہے کہ ہم سب کو یہی نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہئے اور آپ دیکھیں گے جوں جوں وقت گزرتا جائیگا ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی مفہوم میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ایک ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے"

علامہ اقبال اور نظریہ پاکستان:

بیسویں صدی کے نصف اوائل میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں نشاۃ الثانیہ کا تصور پیدا کرنے اور اسے فروغ دینے میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا نام سب سے ... ہے۔ اپنی شاعرانہ بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ جو ان کی تحریر و تقریر اور سیاسی کاموں میں دکھائی دیتی ہے اسے دیکھتے ہوئے بجا طور پر علامہ اقبال کو ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے ایک عظیم قائد سمجھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ایک ایسا سیاسی نظریہ پیش کیا جو مسلمانان برصغیر کیلئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ بعد میں اسلامی پاکستان کی شکل میں عالم وجود میں آیا۔

1930 میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران انہوں نے دو مشہور جملے کہے جنہوں نے انہیں مصور پاکستان کا خطاب عطا ... پنجاب، صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ایک واحد ریاست میں مدغم دیکھنا چاہتا ہوں۔ خود مختار حکومت خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر، مجھے شمالی مغربی ہندوستانی ریاست مسلمانوں کا کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری مقدر معلوم ہوتا ہے"

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر فرمایا کہ یورپی جمہوریت کے اصول ہندوستان پر نہیں کیا جا سکتا یہاں فرقہ واریت اتنی شدید ہے کہ ہندوستان جیسے ملک ...

Lecturer Shaikh Asif Iqbal Zahoori

متحد قسم کی شکل نہیں دی جا سکتی۔ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی وہ واحد طبقہ ہیں جنہیں جدید تصور کے مطابق ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ اسلام میں قوم کے تصور
ہوئے اقبال نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مغربی طرز کی قومیت اور اسلامی نظریہ میں امتیاز کرنا ہوگا کیونکہ اول الذکر کی بنیاد فرد کی اپنے ملک سے وفاداری پر ہے جبکہ
میں مذہب ہی وہ واحد طاقت ہے جو تمام مسلمانوں کو یکجہتی کی ڈور میں باندھ رکھتا ہے۔

اپنی ملت پہ قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پہ انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

چنانچہ اقبال کیلئے پوری امت مسلمہ ایک قوم ہے کیونکہ اس کی بنیاد توحید پر قائم ہے۔ چنانچہ یہ نسل رنگ زبان اور علاقے کے تمام بندھنوں کی تکذیب کرتی ہے
کا بنیادی مقصد تمام انسانیت کو ایک متحدہ شکل دینا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

اقبال کے پاس اسلام ایک آفاقی مذہب ہے جس میں دنیا کی مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھائی چارہ میں باندھ لینے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ
میں اقبال ایک ایسی بین الاقوامی اسلامی ریاست کا خواب دیکھتے تھے جو متحدہ امت مسلمہ پر مشتمل ہو اور جس میں نسلی یا علاقائی بنیادوں پر کوئی امتیاز نہ ہو۔ اقبال
کے بارے میں بحث کرتے ہوئے سیکولر بنیاد کو مسترد کرتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر!

اسلامی یکجہتی کی راہ میں کیا امر حائل ہے؟ مسلمانوں میں نسل پرستی کا رجحان اسلامی یکجہتی کا سب سے بڑا دشمن ہے چنانچہ مسلمان اگر نسل پرستی پر اصرار کرتے رہے
جائیں گے اقبال فرماتے ہیں۔

جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر!
نسل اگر مسل کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگزر!

دسمبر 1931 میں لندن میں منعقدہ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد علامہ اقبال 1932 میں ہندوستان واپس تشریف لائے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے
منتخب ہوئے۔ لیگ کے مارچ 1932 کے اجلاس میں انہوں نے دوبارہ اپنی مجوزہ اسلامی ریاست کا خاکہ پیش کیا انہوں نے کہا۔ دراصل پوری امت کی اصلاح کی ضرورت
ہے تاکہ ہم اپنی امیدیں پوری کر سکیں اور مقاصد حاصل کر سکیں۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے طریقہ کار میں تبدیلی لانی ہوگی۔ خدا بھی ان کی مدد نہیں کرتا جو اپنی مدد آپ
کرتے۔ دانشمندانہ آزادی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اسلام کو لاگو کرنا چاہئے۔ تاکہ ایک مضبوط مملکت کا حصول ممکن ہو
اس مقصد کے حصول کیلئے مسلم امت کے تمام وسائل کو استعمال کیا جانا چاہئے بھرپور قوت ارادی کے ساتھ ایک مستقل پروگرام پر عمل درآمد ہونا ضروری ہے۔
اعتقادِ توحید سے ایک طرف تو باطن میں ہم آہنگی اور توازن پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف پوری امت مسلمہ کیلئے یکجہتی کا اصول مہیا ہو جاتا ہے چنانچہ مسلمان
سانچے میں رہتے ہوئے اسلام کے نظریاتی بندھنوں میں بندھے ہوتے ہیں۔ افراد ہوں یا طبقات اس بندھن کے بغیر بے مقصد ہوتے ہیں جیسا کہ اقبال نے کہا

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرون دریا کچھ نہیں

علامہ اقبال نے 1930 سے لیکر 1937 کے دوران قائداعظم کو جو خطوط لکھے اس میں اس نقطہ نظر کی مزید وضاحت کی ہے جس میں انہوں نے نظریہ پاکستان سے متعلق اپنے خیالات کھل کر بیان کئے ہیں۔ مارچ 1937ء میں انہوں نے قائداعظم کو لکھا "ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی قوت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے"

جون 1937 میں قائداعظم کے نام ایک اور خط میں انہوں نے لکھا "اس وقت مسلم قوم کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہند اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے، صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔ ہندوستان کے مسلمان امید کرتے ہیں کہ اس مشکل موقع پر آپ کی شخصیت ہی ان کو موجودہ مشکل حالات میں سے نکال سکتی ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب مسلم صوبوں پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام ہے۔"

اقبال نے پاکستان کا جو سیاسی نظریہ پیش کیا اس کی جڑیں ان اسلامی اقدار میں گڑی ہوئی ہیں جو قرآنی تعلیمات اور حضور اکرم ﷺ کی سنت میں موجود ہیں۔ پاکستان کا اگر مفصل مطالعہ کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ یہ ملک دو بنیادی عناصر پر مشتمل ہے ایک تو امت مسلمہ کی آفاقیت کے بارے میں قرآنی تصور اور دوسرے اقبال کا تصور خودی۔ اقبال نے دوقومی نظریہ کو اس بنیاد کے طور پر پیش کیا جس سے متاثر ہو کر برصغیر کے مسلمانوں نے ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کے سلسلہ میں حق رائے دہی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر پاکستان کا سیاسی فلسفہ آفاقی ریاست کے تصور اور دوقومی نظریہ پر مبنی ہے۔ اقبال کی تجویز تھی کہ ملت کے اسلامی تصور اور دوقومی نظریہ کو باہم مربوط کر کے انہیں فروغ دیا جائے۔ اقبال نے امت مسلمہ اور غیر اسلامی مملکتوں کے درمیانی فرق کو یوں بیان کیا۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اقبال کا تصور پیغمبری تصور ہے۔ ریاست پاکستان ان کی سیاسی بصیرت کی مرہون منت ہے کیونکہ انہوں نے اپنے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ایک علیحدہ مسلم ریاست کی تخلیق کا مطالبہ کیا تھا۔

مسلم معاشرے کی تجدیدی اصلاح اور تعلیمی تحریکات

شاہ ولی اللہ تحریک: حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے زمانے کے نباض تھے وہ معاشرے کی ناگفتہ بہ حالت اور قوم کی زبوں حالی سے بہت پریشان تھے ان کے زمانے میں معاشرہ بے ہودہ رسوم، رقص و سرور اور ہندوانہ رواج کا شکار ہو چکا تھا اور اورنگزیب کی وفات کے بعد حالات اور بھی خراب ہو چکے تھے۔ سرمایہ داروں نے غریب عوام پر مظالم توڑ رکھے تھے۔ مرہٹے اور سکھ پورے معاشرے میں دندناتے پھر رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے معاشرہ کی اصلاح کا پروگرام بنایا اور شیعہ سنی اختلافات کے خلاف آواز اٹھائی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مندرجہ ذیل کارنامے انجام دیئے۔

۱۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مختلف فرقوں کی غلط فہمیوں کو دور کیا۔
۲۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسلامی اصولوں اور عقائد کی تشریح کی۔
۳۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجلسی برائیوں کو ختم کرنے کی پوری جدوجہد کی۔
۴۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔
۵۔ آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فقہی اختلافات میں اعتدال کی راہ دکھائی۔

سیاسی خدمات:

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے زمانے کے نہ صرف سیاستدان تھے بلکہ بہترین مدبر بھی تھے۔ وہ ہندوستان کی سیاست کو پوری طرح سمجھتے تھے اور انہوں نے اس کا اچھی طرح اندازہ لگایا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو چین کی زندگی گزارنی مشکل ہو جائے گی۔ سکھ اور مرہٹے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اپنا زیرنگین بنالیں گے

لئے انہوں نے اس مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کیا اور دشمن قوتوں کی گوشمالی کیلئے افغانستان کے حکمران "احمد شاہ ابدالی" کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی۔ انہوں نے ابدالی کو لکھا کہ ہندوستان کے حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں۔ اگر مرہٹے اور سکھ مسلمانوں پر اسی طرح مظالم ڈھاتے رہے تو جنوبی ایشیا میں اسلام کا نام تک باقی نہیں رہے گا۔ یہاں مسلمانوں کی حالت قابل رحم ہے اور اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے افلاس و غربت کے بادل مسلمانوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب کی اس تحریر پر احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا رخ کیا اور 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو عبرت ناک شکست دے کر واپس چلا گیا۔ ابدالی کے حملے نے سکھوں اور مرہٹوں کی قوت کو ختم کر دیا۔ اس طرح ملت اسلامیہ کیلئے مستقل خطرہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے مسلمانوں میں سماجی اور سیاسی شعور پیدا کیا اور معاشرے کی نشاۃ ثانیہ کیلئے بھرپور جدوجہد کی۔

سید احمد شہید کی تحریک (تحریک جہاد):

سید احمد دہلوی ہندوستان کے عظیم مجاہد تھے۔ انہوں نے شمالی ہندوستان میں ایک عظیم تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک کو تاریخ برصغیر میں "تحریک جہاد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، 19 ویں صدی کی یہ ایک عظیم تحریک تھی جس نے بعد میں آنے والی تمام تحریکوں کو متاثر کیا اور مسلمانوں میں جدوجہد آزادی کی ایسی روح پھونکی جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنی بقا کیلئے مشترکہ جدوجہد کا جذبہ پوری طرح پیدا ہو گیا اور مشترکہ جدوجہد کا یہ عمل 1947 تک جاری رہا۔

تحریک کا آغاز:

سید احمد شہید نے اپنے اردگرد جو حالات پائے وہ نہایت مایوس کن اور تاریک تھے مسلمانوں میں شدید بے چینی اور اضطراب پایا جاتا تھا ہندوستان کے مسلمانوں میں طاقت ایسی نہ تھی جو غیر اسلامی طاقتوں کے عروج کو روک سکتی۔ اس تاریکی میں شاہ عبدالعزیز نے امید کی ایک نئی شمع روشن کی اور سید احمد بریلوی کو مسلمانوں کی قیادت سونپی۔ سید احمد شہید نے اپنے پیر و مرشد شاہ عبدالعزیز کے حکم پر اپنے لئے ایک مخصوص راہ عمل اختیار کر لی اور جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ آپ نے اپنی اس عوامی تحریک کا آغاز 1818ء میں کیا اور 1821ء میں حج سے واپس آ کر اس تحریک کو اس طرح منظم کیا کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستان کو متاثر اور متحرک کر دیا۔

۱ مسلمانوں کو شر اور غیر اللہ کی عبادات سے روکنا۔

۲ اسلامی تعلیمات کو عام کرنا اور لوگوں کو اسلام کی بتائی ہوئی سیدھی سادھی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرنا۔

۳ مسلمانوں میں پھیلی ہوئی غیر اسلامی رسوم کی اصلاح کرنا۔

۴ مسلمانوں کو اسلام کی سربلندی کیلئے جہاد کی ضرورت اور اہمیت سے آگاہ کرنا۔

اعلان جہاد:

سید احمد شہید کے زمانے میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ابتر ہو چکی تھی وہ مذہبی اور سیاسی لحاظ سے اپنی عظمت کھو چکے تھے، پنجاب کی حالت اس زمانے میں بہت ہی خراب تھی، پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں کا جینا مشکل کر رکھا تھا انہیں مذہبی آزادی نہیں تھی ان کی مساجد کو اصطبلوں میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ ان کی عورتوں کی عزت و عصمت سے کھیلا جا رہا تھا اور مسلمانوں کا قتل عام جاری تھا اس ظلم و ستم کو دیکھ کر سید احمد شہید بے چین اور مضطرب ہو گئے چنانچہ آپ نے شاہ اسماعیل کو حقیقت دریافت کرنے کیلئے پنجاب روانہ کیا۔ شاہ اسماعیل نے واپس آ کر سکھوں کے مظالم کی تصدیق کر دی اور اس پر آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا پروگرام بنایا۔

آغاز ہجرت:

جب مجاہدین کی تعداد دو ہزار سے زائد ہو گئی تو سید احمد شہید نے 17 جنوری 1826 کو بریلی سے روانہ ہو کر راہ ہجرت میں قدم رکھا اور سرزمین وطن کو ہمیشہ کیلئے خیر آباد کہہ دیا۔ آپ گوالیار، ٹونک، اجمیر، حیدرآباد سندھ اور شکارپور سے ہوتے ہوئے درۂ بولان کے راستے کوئٹہ پہنچ گئے۔ 22 اگست 1826ء کو سید احمد کوئٹہ سے روانہ ہو کر قندھار کی طرف چل پڑے۔ قندھار کے مسلمانوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور سپہ سالار عبداللہ نے مجاہدین کی مہمان داری کے فرائض خود انجام دیئے۔ 28 ستمبر 1826ء کے آخر میں سید احمد شہید قندھار سے غزنی اور کابل روانہ ہوئے، جب غزنی کے حکمران نے مجاہدین کا ساتھ دینے کا یقین دلایا تو آپ نے کابل کا رخ کیا۔ کابل میں بھی آپ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کابل کے حکمران اور امراء نے جہاد میں شریک ہونے کا وعدہ کر لیا۔ اس وقت پشاور میں یار محمد خان، پیر محمد خان، سلطان محمد خان اور سید محمد خان برسراقتدار تھے۔ یہ سردار رنجیت سنگھ کو باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے۔

۱۔ **پہلا معرکہ بر مقام اکوڑہ:** جب سید صاحب کی جماعت نے نوشہرہ کو اپنا مرکز بنایا تو سکھوں نے حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں چنانچہ آپ کی جماعت سکھوں کا مقابلہ کر۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

کیلئے نوشہرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر اکوڑہ کی طرف بڑھی۔ اس معرکہ میں 82 مجاہدین شہید ہوئے لیکن سکھ مقتولین کی تعداد ایک ہزار سے کے لگ بھگ تھی۔

۲۔ حضرو کا معرکہ: سید احمد شہید کی جماعت نے اکوڑہ کے معرکے میں کامیابی کے بعد حضرو پر چھاپہ کا منصوبہ بنایا۔ اکوڑہ اور حضرو کے معرکوں میں مجاہدین کی کامیابی نے ان علاقوں کے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا اور ہزاروں مسلمانوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ سید احمد نے ان دونوں علاقوں میں اسلامی حکومت قائم کر دی۔

۳۔ شیدو کا معرکہ: اکوڑہ سے چار میل دور جنوب میں ایک گاؤں "شیدو" واقع ہے۔ حضرو کے معرکے کے بعد مجاہدین نے سلطان محمد خان اور یار محمد خان کی مدد سے شیدو پر حملہ کر دیا اس جگہ سکھوں نے بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جب فتح مجاہدین کے قدم چومنے کے قریب تھی عین اس وقت یار محمد خان نے غداری کی اور وہ مجاہدین سے الگ ہو گیا اس طرح اس معرکہ میں مجاہدین کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ شیدو کے معرکے میں مجاہدین کی جماعت کو بہت نقصان ہوا۔

۴۔ بالاکوٹ کا معرکہ: 1831ء میں مجاہدین کا آخری معرکہ سکھوں کے ساتھ بالاکوٹ کے مقام پر ہوا۔ سکھوں نے ایک منظم فوج کے ساتھ بالاکوٹ کے مقام پر جمع ہونا شروع کر دیا یہ دیکھ کر مجاہدین نے سکھوں پر حملہ کر دیا اور ڈٹ کا ان کا مقابلہ کیا مگر سکھوں کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی اور دوسرے کچھ مسلمان سردار بھی سکھوں کیساتھ مل گئے تھے۔ چنانچہ مجاہدین کو اس معرکہ میں شکست ہوئی اور سید احمد اور شاہ اسماعیل بھی شہید ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی تحریک جہاد ختم ہو گئی اور مجاہدین نے اپنا مرکز "باجوڑ" کو بنا لیا۔

تحریک جہاد نے بہت سی تحریکوں کو جنم دیا میں تحریک ریشمی رومال اور فرائضی تحریک خاص طور پر شامل ہیں۔ تحریک علی گڑھ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ان تحریکوں نے برصغیر میں مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کو روکنے اور مسلمانوں میں سیاسی و مذہبی بیداری پیدا کرنے کیلئے قابل تعریف کوششیں کیں اور جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں میں آزادی کی لہر دوڑا دی۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام:

دارالعلوم دیوبند تحریک علی گڑھ کے مقابلے میں قائم ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ علی گڑھ تحریک جدید تعلیم کیلئے کام کر رہی تھی اور اس تحریک کے تحت دینی علوم کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا جس سے بعض علماء اور فضلا کو یہ گمان ہونے لگا کہ جدید تعلیم سے مسلمان بچوں میں مذہب سے دوری پیدا ہو رہی ہے اور سر سید احمد خان کی تحریک مذہبی تعلیم کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے چنانچہ تحریک علی گڑھ کے مادی سیلاب کو روکنے کیلئے ہندوستان میں کئی ادارے قائم ہوئے جن میں جامعہ ملیہ اور دارالعلوم دیوبند قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا آغاز 30 مئی 1927 کو ضلع سہارنپور کے ایک چھوٹے سے قصبہ دیوبند سے ہوا۔ سب سے پہلے دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ایک معمولی سا مدرسہ قائم کیا گیا جس کے اولین بانیان مولانا فضل الرحمان اور مولانا ذوالفقار علی تھے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اس کے سرپرست تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مدرسہ کی عمارت کا نقشہ اور اس کے اصول وقواعد بنائے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے 1857ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا اور وہ اس جنگ میں زخمی بھی ہوئے تھے صحت یاب ہونے کے بعد وہ حج کیلئے تشریف لے گئے اور واپس آ کر مدرسہ دیوبند میں پچاس روپے ماہوار پر کام کرنے لگے۔ مولانا نانوتوی نے جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم اپنے آنکھوں سے دیکھے تھے اس لئے انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مدرسہ دیوبند میں ایسے جیالے پیدا کئے جائیں جو مسلمانوں کی آزادی کا راستہ ہموار کر سکیں اور ان کے تہذیب و تمدن کے امین بن سکیں۔ ان کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند نے بہت ترقی کی اور مدرسہ کا پورا ماحول پرہیزگاری کا اعلیٰ نمونہ بن گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے مقاصد: دارالعلوم دیوبند کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نانوتوی نے فرمایا: "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں جن میں اسلامی تہذیب وتمدن کے جذبات ہوں اور دین و سیاست کے لحاظ سے ان میں شعور زندہ ہو۔"

۱۔ مسلمانوں کو عربی زبان کی تعلیم دینا۔

۲۔ مشرقی علوم کی تعلیم وتدریس کو عام کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنا۔

۴۔ مسلمانوں کو آزادی ضمیر کے ساتھ ہر موقع پر اعلاء کلمۃ الحق کا اعلان کرنے کیلئے تیار کرنا۔

۵۔ مسلمانوں میں اسلامی تہذیب وتمدن کے جذبات پیدا کرنا۔

۶۔ تصنیف وتالیف اور اشاعت کا باقاعدہ انتظام کرنا۔

۷۔ مجاہدین اسلام کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا جو معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعات اور مشرکانہ رسوم کی اصلاح کر سکے۔

Lecturer SHAIKH ASIF ZAHOORI

دارالعلوم دیو بند کی خدمات: دارالعلوم دیو بند ایک ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک تھی جس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔
اس نے بے شمار مشائخ طریقت، محدث، مفتی، مبلغ، صحافی، مدرسین، اور جید علماء پیدا کئے ان تمام شخصیات نے اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت
مدرسے کی سو سالہ زندگی میں تقریباً نو ہزار مدارس ہندوستان، پاکستان اور بیرون ملک قائم کئے ہیں۔ دارالعلوم دیو بند کا دوسرا اہم کارنامہ
التحصیل ہونے والے علماء، مبلغین، اور مشائخ برصغیر کے تمام علاقوں میں پھیل گئے اور تحریک پاکستان کیلئے سرگرمی سے کام کرتے رہے۔
بہت سے علماء اور مشائخ نے تحریک پاکستان میں عملی طور پر نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔

جامعہ ملیہ دہلی کا قیام: جامعہ ملیہ دہلی کے بانی مولانا محمد علی تھے انہوں نے 1920 میں جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے اس جامعہ کی بنیاد علی گڑھ میں
لیکن تحریک خلافت کے خاتمہ پر اس جامعہ کے مالی اور انتظامی حالات خراب ہو گئے۔ حالات اس قدر خراب اور ناسازگار ہوئے کہ اس کے منتظمین نے اس ادارے کو
کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن حکیم اجمل خان کی کوشش سے یہ ادارہ بند ہونے سے بچ گیا اور کئی ایک لوگوں نے بغیر تنخواہ کے اس ادارے کو چلانے کا ذمہ لے لیا اور یہ طے
کہ اس جامعہ علی گڑھ سے دہلی تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور 1925 میں جامعہ ملیہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا۔

جامعہ ملیہ دہلی کے اغراض و مقاصد: علی گڑھ یونیورسٹی کے نتائج سے مولانا محمد علی اور ان کے ساتھی مطمئن نہ تھے ان کا خیال تھا کہ اس جامعہ سے صرف سرکاری ملازم
پیدا ہو رہے ہیں ان کے اخلاق اور عقائد یورپ سے متاثر ہیں۔ اور وہ حکومت برطانیہ کے وفادار بن کر رہنا چاہتے ہیں ان وجوہ کی بناء پر جامعہ ملیہ کے اغراض و مقاصد
طرح طے کیے گئے۔

۱۔ اس ادارے کو حکومت کے اثرات سے الگ رکھا جائے۔
۲۔ اس ادارے میں تعلیم پانے والے سرکاری ملازمت کے خواستگار نہ ہوں۔
۳۔ اس ادارے میں تعلیم پانے والوں کے اخلاق و کردار اور عقائد مغربی اثرات سے محفوظ رکھے جائیں۔
۴۔ دینی اور انگریزی تعلیم ساتھ ساتھ دی جائے۔
۵۔ اس درسگاہ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو دستکاری کی تعلیم بھی دی جائے۔
۶۔ مسلمان بچوں کو اخلاق کے زیور سے آراستہ کر کے باعزت زندگی گزارنے کا درس دیا جائے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ: تحریک علی گڑھ جدید تعلیم کی حامل تھی اس لئے اس کی مخالفت میں ہندوستان میں کئی ایک ادارے قائم ہوئے۔ ان اداروں میں دارالعلوم دیو بند اور جامعہ
ملیہ دہلی اور ندوۃ العلماء بہت مشہور ہوئے۔ ان اداروں کو قائم کرنے والوں کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب اور جدید تعلیم نے مسلمانوں کو دینی تعلیم سے منحرف کر دیا ہے اور
تعلیم سے انحراف ہی ان کے زوال کا اصل سبب ہے لہذا مولانا سید محمد علی کانپوری نے 1892 میں کانپور کے ایک سالانہ جلسہ میں ہندوستان کے نامور علماء کے سامنے
تجویز پیش کی جس میں بتایا گیا کہ ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں مشرقی اور مغربی علوم کا امتزاج ہو۔ جس میں جدید اور قدیم تعلیم کی خوبیاں ہوں، جس میں دین و دنیا کی تعلیم کا
عمدہ انتظام ہو اور جس کا مقصد مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو دور کرنا ہو۔ ان کی اس تجویز کو بہت سراہا گیا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کی اسلامی اور قومی انجمنوں نے
تائید تجاویز اور قراردادیں بھیجیں۔ علی گڑھ سے نواب محسن الملک اور جسٹس سید محمود نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح ندوۃ العلماء کے قیام کا عمل شروع ہوا۔

ندوۃ العلماء کا قیام: دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام 1894 میں لکھنؤ کے مقام پر عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں سب سے زیادہ کوشش مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر نے کی لیکن
اس کو مستحکم اور مکمل کرنے کا سہرا مولانا محمد علی کانپوری کے سر ہے کیونکہ انہوں نے اس ادارے کی ترقی کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا اسی لئے اس کے اولین بانی اور ناظم بھی
وہی مقرر ہوئے ان کی کوششوں سے جلد ہی یہ ادارہ خاص و عام کا مرکز بن گیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مقاصد:
نصاب تعلیم کو حالات کے مطابق ڈھالنا اور علوم دین کی ترقی کیلئے کام کرنا۔
مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے کام کرنا۔
مختلف علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون کی تعلیم دینا۔
مسجد نبوی کے نقشہ کے مطابق ایک شاندار مسجد تعمیر کرانا۔

۵۔ طلباء کی تعلیم کے لئے [illegible] قائم کرنا۔

۶۔ مکمل دارالعلوم قائم کرنا۔

۷۔ علماء کے اختلافات ختم کر کے ان میں اتحاد اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا۔

۸۔ ایک شاندار کتب خانہ قائم کرنا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمات: ندوۃ نے مسلمانوں کی بہتری کیلئے [illegible] اہم [illegible] تعلیم [illegible] کا نصاب تیار کیا گیا جس سے طلباء میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا [illegible] کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سید سلیمان ندوی، مولانا [illegible] ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی [illegible] جیسے علماء پیدا کئے جنہوں نے [illegible] بیش بہا خدمات انجام دیں اور تحقیقی کتابیں لکھ کر لازوال شہرت حاصل کی۔

مدرسہ منظر الاسلام بریلی کا قیام: دارالعلوم منظر الاسلام [illegible] بریلی میں [illegible] مشہور ہو گیا یہاں [illegible] بنگال، بہار، پنجاب، سرحد اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے ہزاروں طلباء حصول علم کیلئے آتے تھے [illegible] سے فارغ ہو کر [illegible] اس مدرسہ [illegible] لاکھوں طلباء مستفید ہوئے۔

مدرسہ منظر الاسلام نے اشاعت اسلام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مدرسہ سے ایسے ایسے علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلے جنہوں نے [illegible] دشمنان اسلام کی جماعت بندی کے ساتھ مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان کی راہ متعین کی۔ یہاں سے فارغ ہونے والے علماء نے ہندوستان میں کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی [illegible] جب 1924ء میں شردھانند نے فتنہ ارتداد اٹھایا تو اسی مدرسہ کے علماء نے اس فتنہ کا [illegible] سے مقابلہ کیا۔

مدرسہ منظر الاسلام کے کارنامے: اس مدرسہ نے دو قومی نظریہ [illegible] مسلمانوں کیلئے بہت سے کام انجام دیئے۔ سب سے بڑا کارنامہ اس مدرسہ کے علماء کا یہ ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی مذمت کی اور دو قومی نظریہ کی حمایت کی اور مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں کے چنگل سے نجات دلانے کی تجاویز پیش کیں۔ اس مدرسہ کی خدمات اور کارنامے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جماعت رضائے مصطفیٰ کا قیام: مدرسہ منظر الاسلام کے دانشوروں نے 1917ء میں جماعت رضائے مصطفیٰ قائم کی جس کا مقصد مسلمانان ہند کو جذبات کے سیلاب میں بہنے سے روکنے اور ہندوؤں کے عزائم سے آگاہ کرنا تھا۔ اس جماعت نے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی حالت سدھارنے کیلئے کافی کوشش کی اور مختلف رسائل کے ذریعے مسلمانوں کو اس ضمن میں مفید تدابیر سے نوازا۔

۲۔ انصار الاسلام کا قیام: مدرسہ منظر الاسلام کے علماء اور دانشوروں نے مسلمانوں کی حفاظت اور ان کے نظریات کے دفاع کیلئے ایک تنظیم "انصار الاسلام" کے نام سے بریلی میں قائم کی۔ اس تنظیم میں شامل علماء نے بہت سے مقامات پر جلسے کئے جن میں مولانا احمد رضا بریلوی کے صاحبزادگان، خلفاء اور احباب نے تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ اور دشمنوں کی چالوں سے متنبہ کیا۔ اس تنظیم کا مقصد مقامات مقدسہ کا تحفظ کرنا اور مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی مفاد میں رہنمائی کرنا تھا۔

۳۔ غیر مسلموں سے تعلقات کی مذمت: مدرسہ منظر الاسلام کے عالموں اور مفتیوں نے ہندوؤں، یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تعلقات رکھنے کی مذمت کی اور صاف صاف الفاظ میں بتادیا کہ ہندوؤں کے ساتھ مروت کا برتاؤ کرنا اور انگریزوں سے تعلقات بڑھانا سراسر حماقت ہے کیونکہ ان میں سے کوئی بھی دوستی کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے چنگل سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور اس طرح مدرسہ کے تمام اہل علم حضرات نے تقریر کے ذریعے مسلمانوں کو اسلام کے دشمن سے ہوشیار رکھا اور انہیں جہاد کیلئے تیار کیا۔

۴۔ مسلمانوں کی سلامت روی کیلئے تجاویز: مدرسہ منظر الاسلام کے علمائے کرام نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سلامت روی کیلئے بہت سی تجاویز پیش کیں اور انہیں بتایا کہ غیر قوم کی چال میں نہ آئیں۔ اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں رکھیں، اپنے مقدمات کا فیصلہ خود کریں، اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں، بلکہ اعتدال اختیار کریں تاکہ وہ معاشی بدحالی کا شکار نہ ہوں، اسی میں مسلمانوں کی سلامتی ہے اس لئے انہیں سلامت روی اختیار کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دوسروں کے دست نگر بن جائیں گے۔

Lecturer SHAIKH ASIF ZAHOOR IQBAL

۵۔ نصاب تعلیم کی خامیوں کی نشان دہی: مدرسہ منظر الاسلام کے عالموں اور صاحب نظر حضرات نے اس وقت کے نصاب تعلیم پر سخت تنقید کی اور اس کی خامیوں کی نشان دہی فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے نصاب تعلیم میں بہت سے علوم رسمی طور پر پڑھائے جاتے ہیں، جن کو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طاق نساں میں رکھ دیا جاتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ مفید علوم کی تعلیم دی جائے۔ آرٹس اور سائنس کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے، کیونکہ آرٹس سے انسان بنتا ہے اور سائنس سے مشین نہیں کر سکتا اور نہ ہی مشین انسان کا کام کر سکتی ہے اس لئے دونوں کی بیک وقت ضرورت ہے، دونوں علوم انسانیت کیلئے اس وقت مفید ہونگے جب دونوں کو ملا دیا جائے ان کا تطابق دینی علوم سے بھی کیا جائے۔

۶۔ وحدت اسلامیہ کیلئے جدوجہد: مولانا بریلوی کے اور ان کے دوسرے رفقائے کار نے پر آشوب دور میں وحدت اسلامیہ کیلئے پورے خلوص کے ساتھ کام کیا اور مدرسہ منظر الاسلام کے اہل علم حضرات نے ہندو مسلم اتحاد کی زہر آلود فضاؤں میں بھی وحدت ملی کے چراغ روشن کئے اس کام کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ اخلاقی اور معاشی حالت کو سنوارے بغیر میدان جنگ میں نہیں کودنا چاہئے اور نہ ہی دشمن سے ٹکر لینی چاہئے ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، لیکن اس مصلحت کی بنا پر حق گوئی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے غالباً اسی وجہ سے مولانا فرنگی محل اور دوسرے زعماء نے مولانا بریلوی اور ان کے رفقاء کار پر انگریزوں کا پٹھو ہونے کا الزام لگایا تھا یہ اس جماعت کے ساتھ سراسر زیادتی تھی، حالانکہ مولانا بریلوی کا موقف درست تھا۔

۷۔ آل انڈیا سنی کانفرنس کا قیام: مدرسہ منظر الاسلام کے علماء اور مولانا احمد رضا خان کے خلفاء نے 1925ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کی بنیاد رکھی اور اس تنظیم کی شاخیں پورے ہندوستان و پاکستان میں کھولیں۔ اس تنظیم کا مقصد مسلمانوں کے لئے آزادی و حریت کی راہیں متعین کرنا تھا، اس تنظیم کے ماتحت جنوبی ایشیاء میں جگہ جگہ جلسے ہوئے جن میں مسلمانوں کو آزادی کیلئے ابھارا گیا، اس کانفرنس کی کوشش سے تحریک پاکستان میں جان پڑ گئی تھی۔

۸۔ تقسیم ہند کی تائید: جب 1930ء میں علامہ اقبال نے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا خاکہ کھینچا تو اس وقت مدرسہ منظر الاسلام کے تمام اہل علم اور صائب الرائے حضرات نے اس کی پرزور حمایت کی، اور قیام پاکستان کیلئے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان کی حمایت میں آل انڈیا سنی کانفرنس نے بھارت کے شہر بنارس میں ایک زبردست جلسہ منعقد کیا جس میں کہا گیا۔

آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبہ پاکستان کی پرزور حمایت کرتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ علماء مشائخ اہل سنت اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کی ہر امکان قربانی کے واسطے تیار بھی رہیں، اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے ایک حکومت قائم کریں جو قرآن کریم اور حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں فقہی اصول کے مطابق ہو۔ اس موقع پر اسلامی حکومت کے لائحہ عمل کیلئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں مولانا شاہ احمد نورانی کے والد ماجد مولانا عبدالعلیم صدیقی بھی شامل تھے۔

انجمن حمایت الاسلام لاہور: انجمن حمایت الاسلام کی بنیاد 1884ء میں خلیفہ حمید الدین نے رکھی، وہی اس کے پہلے صدر تھے۔ اور انجمن کے پہلے سیکرٹری مولوی غلام اللہ تھے، ان دونوں حضرات نے انجمن کی ترقی کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں ان کے بعد جن دردمند نے اس انجمن کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان میں منشی عبدالرحیم، منشی چراغ علی، سر محمد شفیع، ڈاکٹر اقبال، سر عبدالقادر اور مولوی غلام محی الدین خان قصوری قابل ذکر ہیں۔

انجمن کے اغراض و مقاصد:

۱۔ عیسائی مشنریوں اور پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا سدباب کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کی معاشرت، تہذیب اور عقائد کی اصلاح کرنا۔

۳۔ مسلمان بچوں اور بچیوں کیلئے تعلیمی ادارہ قائم کرنا۔

۴۔ مسلمانوں کو جدید تعلیم اور جدید تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے تیار کرنا۔

۵۔ مسلمانوں میں دینی اور اسلامی شعور پیدا کرنا۔

۶۔ مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کرنا اور ان میں جذبہ جہاد ابھارنا۔

۷۔ مسلمانوں کے ثقافتی ورثہ کی حفاظت کیلئے اقدامات کرنا۔

انجمن کی سیاسی خدمات: انجمن حمایت الاسلام لاہور نے برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور مسلمانوں میں علیحدہ وطن حاصل کرنے کا جذبہ ابھارا۔ ان میں اتحاد و اتفاق کی فضاء پیدا کی۔ اس انجمن کے قائدین کارکنان اور طلباء نے مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہو کر مسلمانان ہند کو جداگانہ قومیت کا تصور دیا، 1940ء میں

Lecturer

اس کے قائدین نے قرارداد پاکستان کی پرزور حمایت اور تائید کی۔ 1945ء اور 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کا پورا ساتھ دیا۔ اس انجمن کے تعلیمی اداروں کے طلباء مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور قائداعظم کے جان نثار سپاہی تھے۔ اس طرح اس انجمن کے تعلیمی اداروں کے طلباء مسلم لیگ کے سرگرم کارکن اور قائداعظم کے جان نثار سپاہی تھے۔ اس طرح اس انجمن نے تحریک پاکستان کیلئے امتیازی خدمات انجام دیں۔ سیاسی اعتبار سے یہ انجمن اس قدر فعال تھی کہ ملک کے بڑے بڑے لیڈر، علماء اور قائدین اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کو خراج تحسین پیش کرتے تھے۔ سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال پیش پیش تھے۔ چوہدری رحمت علی جنہوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا تھا۔ انجمن کے اسلامیہ کالج کے ہونہار اور ذہین طالب علم تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد سے پہلے دو قومی نظریہ کی حمایت کر دی تھی اور مسلمانوں کے بننے والے نئے ملک کا نام پاکستان رکھا تھا۔ انہوں نے ہی پاکستان کے نام سے انگلستان میں ایک تحریک شروع کی۔ یوں اس طرح اس انجمن کے کالجوں سے فارغ ہونے والے طلباء قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور آج بھی اس انجمن کے قائم کردہ ادارے علمی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

سندھ مدرسۃ الاسلام کا قیام: 1885ء میں حسن علی آفندی نے جسٹس سید امیر علی کے مشورے سے ایک کمیٹی بنائی جس کا کام ایک مدرسے کے قیام کے رقم جمع کرنا اور تعلیمی پروگرام تیار کرنا تھا۔ کمیٹی کے ارکان نے قلیل عرصہ میں کافی رقم جمع کر لی اور تعلیمی ترقی کے لئے جامع پروگرام بنالیا۔ اس طرح 1885ء میں حسن علی آفندی کی کوششوں سے سندھ مدرسۃ الاسلام کا قیام عمل میں آگیا۔ سندھ کے قائدین اور عوام مدرسے کی مالی مدد کرتے رہے۔ مسلم ریاستوں کے نوابوں نے بھی دل کھول کر اس مدرسہ کو مالی امداد دی۔ مالی مدد کیلئے حسن علی آفندی اور سندھ کے دوسرے ممتاز رہنماؤں نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ان کا دورہ بہت کامیاب رہا۔ نواب جونا گڑھ اور نظام حیدر آباد دکن نے مدرسہ کیلئے خطیر رقم دی۔ اس طرح سندھ مدرسہ ترقی کرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی اور سرکار سے مالی مدد ملنے لگی۔ لیکن 1938ء میں سندھ مدرسہ حسن علی آفندی کے بیٹے حسن علی عبدالرحمٰن کی کوششوں سے سرکاری سرپرستی سے نکل آیا تھا۔ اور اس کی مالی پوزیشن بہت مستحکم ہو چکی تھی۔

خدمات: سندھ مدرسۃ الاسلام نے بہت ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے کراچی اور سندھ کے پسماندہ علاقوں میں تعلیمی روح پھونک دی۔ اندرون سندھ سے طلباء اس میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے آنے لگے۔ ان طلباء کی رہائش کیلئے ایک بورڈنگ بھی بنایا گیا۔ مدرسے کے احاطے میں ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی، تاکہ مسلمان طلباء نماز کے ساتھ ساتھ دینی علوم سے بھی استفادہ کرتے رہیں۔ سندھ مدرسہ ترقی کرتے ہوئے ایک تعلیمی اور سیاسی تحریک کا روپ اختیار کر گیا اور 1942ء میں اسے کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے کئی ادارے وجود میں آگئے، جن میں ایس ایم آرٹس کالج، ایس ایم سائنس کالج، ایس ایم کامرس کالج اور ایس ایم لاء کالج شامل ہیں۔ سندھ مدرسہ نے ممتاز اور نامور سپوت پیدا کیے جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ پر گہرے اور انمٹ نقوش مرتب کیے ان قابل فخر سپوتوں میں قائداعظم، سر غلام حسین ہدایت اللہ، شیخ عبد المجید سندھی، شاہنواز بھٹو، سر عبداللہ ہارون اور ڈاکٹر داؤد پوتا قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ مدبرین تھے جنہوں نے تحریک پاکستان کو پوری آب و تاب کیساتھ کامیاب بنایا اور قیام پاکستان کیلئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ سندھ مدرسہ نے مسلمانوں میں سیاسی بصیرت اور فکر پیدا کی، مسلمانوں کو عزم و حوصلہ دیا۔ اور قیام پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں آنے والے طلباء کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کیا۔

اسلامیہ کالج پشاور کا قیام: صاحبزادہ یعقوب خان نے علی گڑھ کی طرز پر 1913ء میں پشاور میں ایک کالج قائم کیا۔ جس کا نام اسلامیہ پشاور کالج تھا۔ اس کالج کا سنگ بنیاد آزادی کے مشہور و معروف مجاہد حاجی ترنگ زئی کے ہاتھوں سے رکھوایا گیا۔ سنگ بنیاد رکھنے کے بعد حاجی صاحب نے کالج کی ترقی کیلئے روح پرور دعا کی۔ ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ اسلامیہ کالج پورے برصغیر میں دیکھتے ہی دیکھتے مشہور ہو گیا۔ کالج کی عمارت نہایت خوبصورت اور کشادہ ہے۔ اس کالج کا کتب خانہ قابل دید ہے، جس میں ہر زبان کی کتابیں موجود ہیں۔

کالج کی انتظامیہ: اسلامیہ کالج کی انتظامیہ ایک انوکھی اور اپنی نوعیت کی انتظامیہ تھی، اس قسم کی مجلس انتظامیہ پورے ہندوستان میں شاید ہی کسی تعلیمی ادارے کی ہو، اس کالج کی مجلس انتظامیہ میں ہر شعبہ زندگی کے مقتدر حضرات شامل تھے، جن میں علاقے کا ڈپٹی کمشنر صوبہ کے ماہرین تعلیم، انجینئر، میڈیکل آفیسر اور پولیس کے اعلیٰ عہدیدار افراد شامل تھے۔ ان تمام حضرات کی کوششوں سے کالج میں طلباء کی رہائش، سماجی اور سیاسی تعلیم و تربیت کے احسن انتظامات کیے گئے۔

کالج کی خدمات: اسلامیہ کالج نے تعلیمی، سماجی اور سیاسی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، اس ادارے نے صوبہ سرحد میں مسلمانوں میں فکری اور عملی سطح پر بیداری کی لہر پیدا کر دی۔ اس کالج سے فارغ التحصیل طلباء نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کالج کا فیض پشاور سے لیکر ہندوستان کے دور افتادہ علاقوں تک پھیل گیا۔ اور دور دور کے علاقوں سے طلباء اس میں تعلیم کیلئے آنے لگے۔ اس کالج نے مسلمانوں میں جذبہ آزادی، جذبہ حب ایمانی اور جذبہ تعلیم کو پوری طرح اجاگر کیا، یہی وجہ ہے کہ اس کالج کے طلباء نے قدم قدم پر مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا نعرہ لگایا۔

مسلمانوں کے اقتدار کا زوال

اٹھارویں صدی عیسوی انسانی تاریخ کے ارتقاء میں ایک ایسے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے جب سفید فارم یورپی اقوام اور مسلمانوں نے دو بالکل مخالف سمتوں میں پیش قدمی کی۔ یورپ میں طاقتور بادشاہتیں حکمرانی کر رہی تھیں اور یورپی تاجر ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن تھے جبکہ دوسری طرف مسلمان طاقتیں دنیا میں ہر جگہ زوال پذیر ہو گئی تھیں۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت اورنگزیب عالمگیر کی 1707ء میں وفات کے بعد بڑی تیزی سے کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس کمزوری اور سلطنت مغلیہ کی زوال تک پہنچنے کی بڑی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ اورنگزیب کے جانشین بہت زیادہ کمزور ثابت ہوئے لیکن دراصل مسلمانوں میں احساس یکجہتی کے فقدان سے مغلیہ سلطنت کا

عقائد مذہبی سے غفلت:
متحکم ایمان ہی مسلمانوں میں متحکم اتحاد کا باعث بنتا ہے۔ ایک عقیدے سے وابستگی کا احساس ہی وہ طاقت ہے جس کی وجہ مسلمان جو تعداد کے لحاظ سے ایک کروڑوں غیر مسلموں پر حکومت کی صلاحیت کے حامل تھے۔ لیکن جب جدت پسند خیالات کی بھرمار سے مسلمانوں کا مذہبی عقائد سے غفلت کا دور شروع ہوا تو ملیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اکبر نے ہندوؤں کو اعلیٰ مناصب پر فائز کر کے ان کا شاہی دربار میں اثر ورسوخ بڑھا دیا جس سے مسل سلطنت کی پالیسی میں تبدیلی واقع ہوئی جس کے نتیجہ میں قدامت پرست مسلمان سلطنت کا تحفظ کرنے کے اہل نہ رہے یہ ایک فاش غلطی تھی کہ ہندوؤں سے مسلم سلطنت کی حمایت میں توقع وابستہ کی گئی۔ مسلمان ریاستی معاملات میں بالادستی رکھتے تھے لیکن خود سلطنت غیر اسلامی کی حال ہوتی چلی گئی۔ اکبر نے ہندوؤں کو بہت کچھ نوازا لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کے جذبات سکا۔ اقبال نے مسلمانوں کی اسی مذہبی جہالت اور بے راہ روی کے بارے میں جواب شکوہ میں فرمایا۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

یکجہتی کا فقدان: یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بہت سی مراعات اور ترجیحات سے نوازنے کے باوجود ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف مخاصمانہ رویہ برقرار رکھا مسلم سلطنت کا مکمل انحصار مسلمانوں کی طاقت اور ان کی یکجہتی پر تھا لیکن چونکہ مسلم یکجہتی ختم ہو چکی تھی اس لئے مسلم سلطنت ہندوؤں کی حمایت پر انحصار کرنے کیلئے مجبور اورنگزیب عالمگیر نے اس صورت حال کو درست کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اسلامی احساس کا بڑی حد تک نشاۃ الثانیہ میں کامیابی حاصل کی اگر اس کے جانشین بھی طرح مثالی کردار اور عزم کا مظاہرہ کرتے تو مسلمانوں کی یکجہتی دوبارہ قائم ہو سکتی تھی اور اس میں خاطر خواہ ترقی ہو سکتی تھی۔

مغلیہ انتظامیہ کی مرکزیت: مغل انتظامیہ بہت بڑی حد تک مرکزیت کی حامل تھی حکومت کے سارے کارندے اور عہدہ داران شہنشاہ کے احکامات کی تعمیل کرنے کے تھے صوبے خود مختار نہ تھے اور ان کی انتظامیہ پوری طرح مرکز کی سخت نگرانی اور گرفت میں تھی۔ اس نظام میں ایک قسم کی موروثی کمزوری تھی کہ جیسے ہی مرکز کمزوری کا شکار اس کے نتیجہ میں سازشوں نے جنم لیا اور تاجپوشی و معزولی کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلا جس میں مغلیہ سلطنت کے آخری حکمران پھنس کر رہ گئے۔

جانشینی کے قانون کا نہ ہونا: مغل جانشینی کا قانون بنانے میں ناکام رہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر مرنے والے بادشاہ کے بیٹوں نے خود کو تخت وتاج کا وارث سمجھنا شروع اور جانشینی کیلئے خونی تصادم ناگزیر ہو گیا۔ مغلوں میں جانشینی کا مسئلہ پرامن طور پر کبھی بھی حل نہیں ہو سکا اکبر کے جو تنہا تخت کا وارث تھا اور اس کا کوئی مدمقابل (وارث نہ تھا اس لئے ہمایوں کے انتقال کے بعد وہ پرامن طریقہ سے تخت نشین ہو گیا اور جانشینی کی کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن شاہجہاں کی حکومت کے آخری سالوں میں اس کے بیٹوں کے درمیان جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ اسی طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد ایک دہائی سے کچھ عرصہ میں جانشینی کی سات جنگیں ہوئیں جن میں کئی شہزادے اور تربیت یافتہ سپاہی مارے گئے علاوہ ازیں جنگوں کی تباہی سے مسلسل انتظامیہ درہم برہم ہوتی رہی۔ ایک نہایت ہی تباہ کن صورت حال اس وقت پیدا ہوئی جب ایسے شہزادے بڑے علاقوں پر حکومت کر رہے تھے اور ان کی حمایت کرنے والوں نے بیرونی طاقتوں سے رابطے قائم کرنے شروع کر دیئے تاکہ نازک موقعوں پر ان کی حمایت حاصل کر سکے۔

قیادت کی کمزوری: سیاسی اقتدار کے نقصان کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے کردار میں ایک بحران پیدا ہو گیا، وہ نااہل، تنگ نظر، خود غرض اور حرام کھانے والے (رشوت خور) بن گئے اور یہ برائیاں ان کی ارواح میں سرایت کر گئیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کو یہ شکایت تھی کہ لوگوں میں دیانت داری اور خلوص کی بے حد کمی واقع ہو گئی ہے اور اہلیت رکھنے والے لوگ دستیاب نہیں ہیں جو حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز کئے جا سکیں۔ سپہ سالاروں اور وزیروں نے مسلم سلطنت کے مفادات کو پس پشت

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

[illegible] خوش حالی اور اقتدار کے ایک طویل عرصہ تک قائم رہنے سے مسلم معاشرے میں دولت کی ریل پیل ہوگئی جس کی [illegible] آرام کی زندگی گزارنے کے عادی ہوتے چلے گئے۔ جذبہ جہاد جو مسلم مملکت کی بنیاد تھی وہ بھی بتدریج معدوم ہوگیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ [illegible] (کرپشن) نے جنم لیا۔ خاص طور پر مسلم اکابرین وزعماء میں یہ خرابی زیادہ فروغ پاگئی اور اس کا لازمی اثر معاشرہ کے [illegible] مصلحین اور دانشوروں نے مسلمانوں کے مثالی اخلاق کی احیاء کیلئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اور ان کو مکمل تباہی [illegible]

[illegible] پسماندگی بھی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے فعال کردار کو ترک کر کے تباہی کے دہانے تک پہنچ گئے۔ غور وفکر [illegible] کی تخلیقی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ مسلمان جدید یورپی علوم کی محرک قوت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ کوئی بھی معاشرہ جس میں تخلیقی صلاحیت ختم [illegible] اس کی ترقی کرنے کی صلاحیت اور کارکردگی کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ اب دنیا ویسی نہیں رہی تھی جس میں مسلمانوں نے [illegible] یورپی اور برطانوی اقوام سائنسی علوم اور تکنیکی مہارتوں میں زبردست ترقی کر رہی تھیں انہوں نے طاقتور مقام حاصل کر لیا تھا [illegible] یورپی اقوام نے ایسی تحریک اور استعداد پیدا کر لی تھی جس سے کام لیتے ہوئے وہ حکومت چلانے اور مؤثر جنگی مہارت [illegible] مشرق میں ان کے مقابل میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوسکی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی مادی پستی کی طرف مائل ہوگئی یہاں تک کہ وہ مسلم [illegible] بطریق احسن چلا رہے تھے اور اسی مادر وطن میں خوش حال زندگی گزار رہے تھے وہ بھی زبردست خطرات میں گھر گئے اور ان کا وجود خطرہ [illegible]

عسکری نا اہلیت (فوجی کمزوریاں): دانشوری کے فقدان کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں عسکری نا اہلیت کو فروغ حاصل ہوا اور اس میں جمود کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ بابر نے [illegible] کو برصغیر میں متعارف کیا تھا لیکن اس کے بعد مسلمان اس سلسلہ میں فوجی ہتھیاروں اور ساز وسامان میں کوئی جدیدیت پیدا نہ کر سکے۔ مقامی طور پر بھرتی ہونے والے فوجیوں کی تربیت اور توپ خانے کے استعمال میں نئے طریقے متعارف کرنے میں پیش رفت کرنے کیلئے کوئی اقدامات نہ کئے گئے اور زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکے کہ توپ خانہ کیلئے غیر ملکیوں کی خدمات حاصل کریں۔ ان حالات میں مغلیہ سلطنت کا زوال صرف وقت گزرنے کا منتظر تھا۔ مہم جو قسم کے منصب داروں کو فوجیں رکھنے کی اجازت دی گئی جس سے مغلیہ سلطنت کی فوجی طاقت میں اضافہ مقصود تھا لیکن اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان منصب داروں نے اپنی ذاتی طاقت میں اضافہ کر لیا اور اس طرح مغل بادشاہ کے اقتدار میں کمی واقع ہوگئی اور جب نادر شاہ نے حملہ کیا تو مغل فوجوں کے وقار کو زبردست دھچکا لگا اور پھر وہ کبھی اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ بحال نہ کر سکے۔

بحری فوج کی عدم موجودگی: بحری فوج قائم نہ کر کے سلطنت مغلیہ نے خودکشی کے مترادف حرکت کی۔ انہوں نے اپنی دفاعی طاقت کو شمال مغربی دروں کی حفاظت پر مرکوز کیا تھا کیونکہ یہی تاریخی اہمیت کے راستے تھے۔ یہ بات مغل حکمرانوں کے سان وگمان میں بھی نہ تھی کہ ان کی حکومت کو یورپی تجارتی برادری کی بحری طاقت ختم کر دے گی۔ سولہویں صدی میں پرتگیزی سرگرمیوں کو دیکھ کر بھی ان حکمرانوں کی آنکھ نہ کھلی۔ جس زمانہ میں طاقتور مغل شہنشاہ اکبر کی حکومت تھی اس وقت بھی پرتگیزی بحری قزاقوں نے مسلم تاجروں اور حاجیوں کے جہازوں کو لوٹ لیا تھا انہوں نے بنگال کے ساحلی علاقوں پر جہانگیر اور شاہ جہاں کے دورِ حکومت میں حملے کئے تھے۔ مغل حکمران اورنگزیب کے دور میں انگریز تاجروں نے بنگال اور سورت میں مغلیہ اقتدار کیلئے ایک چیلنج کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ان باتوں سے آنے والے دور میں خطرات کی نشاندہی ہو چکی تھی اس کے باوجود مغل حکمرانوں نے بحری فوج قائم نہ کر کے فاش غلطی کا ارتکاب کیا۔ نواب علی وردی خان نے اس مسئلہ کی اہمیت کا پہلی بار احساس کیا لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی اور حالات پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ خود نواب بوڑھا ہو گیا تھا اور مرہٹوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا اور خود افغان جرنلوں کی بغاوتوں کی فرو کرنے میں اسے قوت صرف کرنی پڑ رہی تھی اس لئے وہ کوئی بحری فوج تشکیل نہ دے سکا۔ نواب سراج الدولہ اپنی مملکت سے انگریزوں کو باہر اس لئے نہ نکال سکا کیونکہ اسکے پاس کوئی بحری فوج نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان حکمرانوں کو ایک تجارتی کمپنی نے جس کو اپنے ملک کی بحری طاقت کی حمایت حاصل تھی ذلت آمیز تاریخی صدمے سے دوچار کر دیا اور ان سے حکومت چھین لی۔

...............✪...............

برصغیر پاک وہند میں برطانوی حکومت کا قیام

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی 1600ء سے تجارتی اغراض کیلئے مستقل طور پر اپنے قدم جمانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی جبکہ دوسری اقوام بھی تھیں یا برطانوی سامراج کے ساتھ شانہ بشانہ آگے بڑھنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں کیونکہ انگریزوں کو ہندوستان میں دوسری اقوام پر فوقیت حاصل تھی کے اثر ورسوخ کو نہایت مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور 1767ء میں انگلستان واپس چلا گیا۔ جب کوئی یورپی طاقت انگریزوں سے مقابلہ فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کے سیاسی حالات کے مدنظر خود کو ایک سیاسی قوت بنانے میں مشغول ہو گئے انہوں نے مقامی حکمرانوں کی تیار کیا اور پھر اسی پالیسی پر چلتے ہوئے انہوں نے ہندوستان فتح کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ڈپلومیسی کی اعلیٰ صلاحیتوں کو استعمال کیا اور جنگ سے کام لیا۔ ہندوستانی حکمران خود اپنی افراتفری اور عدم استحکام کا شکار ہو گئے وہ مجبور ہو گئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بالادستی قبول کریں برطانوی توسیع طریقہ کار کسی نہ کسی روپ میں عرصہ دراز تک جاری رہا اور ایک کے بعد ایک دوسری مملکت اس کے زیر تسلط آتی گئی یہاں تک کہ انہوں نے پیش رفت کر کے مغلوں کے جانشین کی حیثیت حاصل کر لی۔

انگریزوں کی کامیابی کے اسباب: چند اسباب جو انگریزوں کی کامیابی کے ذمہ دار تھے ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ انگلش کمپنی ایک نجی ادارہ تھی جس نے لوگوں میں خود انحصاری کا جذبہ پیدا کیا۔ انہیں اس بات کا شعور تھا کہ اگر وہ وقت محنت کریں تو انہیں کثیر منافع حاصل ہو سکتا ہے اور اگر وہ کاہلی کا مظاہرہ کریں تو بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی کمپنی خوش حال ہو گئی اور اس کی مالی حالت اس قدر بہتر ہو گئی کہ وہ حکومت کو قرضے دینے کے قابل ہو گئی۔ چوں کہ یہ نجی نوعیت کی کمپنی تھی اس لئے اس کو یہ فائدہ پہنچا کہ وطن میں (برطانیہ میں) ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور ہندوستان میں اس کی مالی ساکھ اور دولت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ انگریزوں کی کامیابی کی یہ تھی کہ ان کے پاس بحری طاقت کی فوقیت موجود تھی اور برطانوی حکومت ہندوستان میں جب چاہتی امداد بھیج سکتی تھی اور سمندر میں ان کی پیش قدمی روکنے والا کوئی نہ تھا۔

۳۔ بمبئی میں برطانیہ کا بحری اڈہ موجود تھا اور وہ بمبئی میں اپنے بحری جہاز بہ حفاظت رکھ سکتے تھے اور موقع کے اعتبار سے بر وقت کارروائی کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بمبئی میں ان بحری جہازوں کی مرمت کرنے کا انتظام موجود تھا۔

۴۔ انگریزوں کا ہندوستان میں تین اہم مقامات پر تسلط تھا۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس۔ اس لئے اگر ان میں سے کسی ایک مقام پر دشمن کا قبضہ ہوتا تو دوسرے دو مقامات سے دشمن کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی اور حالات پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ اگر بیک وقت دو مقاموں پر قبضہ ہو جاتا تو تیسرے مقام سے کارروائی کی جا سکتی تھی کیونکہ ان مقامات کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ تینوں مقامات پر مخالفین ایک ساتھ قبضہ کر لیتے۔

۵۔ انگریز ہندوستان میں صحیح سمت سے داخل ہوئے۔ وہ پہلے بنگال میں وارد ہوئے جہاں کی سرزمین بہت زرخیز تھی اور لوگوں کے پاس کافی سونا موجود تھا اس لئے یہاں مہم جوئی کرنے سے انگریزوں کو کافی دولت ملی۔ اس کے علاوہ دریائے گنگا کے راستے وہ ملک کے اندرونی علاقوں کی طرف پیش رفت کر سکتے تھے اور بنگال سے وسط ہند تک پہنچنا ان کیلئے آسان تھا۔ چونکہ ملک میں اچھی سڑکوں کا فقدان تھا اس لئے نئے دریائی راستے آمد و رفت اور نقل و حمل کیلئے انتہائی مفید ثابت ہوئے۔

۶۔ انگریز اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کو انتہائی قابل لوگوں کی خدمات حاصل ہوئیں مثلاً لارڈ کلائیو لارڈ لارنس اور سر ایری کوٹے۔ انگریز ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کا بڑا راز تھا۔

✩

1857ء کی جنگ آزادی کے اسباب ونتائج

1857ء کی جنگ آزادی کے گوناگوں اسباب تھے جن میں سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور فوجی اسباب قابل ذکر ہیں۔ بے چینی اور احساس محرومی کا احساس مسلمانوں میں ہندوؤں کے مقابلے میں دوگنا تھا کیونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا اور تاریخ میں پہلی بار ہندوستان پر (صدیوں تک) حکومت کرنے والے مسلمانوں کو غلامی اور محرومی کی ذلت سے سابقہ پڑا تھا۔ برصغیر میں انہیں جو مقام حاصل تھا اس سے محرومی اور اس کے علاوہ انگریزوں کا مسلمانوں کیساتھ ہتک آمیز جانب دارانہ سلوک اور ان پر عدم اعتماد نفسیاتی طور پر مسلمانان ہند کو بغاوت پر آمادہ کرنے کیلئے کافی تھا۔

سیاسی اسباب:

لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی نے مسلمانوں کو چراغ پا کر دیا جس کے تحت مسلمانوں کے سارے علاقے اور اختیارات سلب کر لئے گئے اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر انگریزوں کا وظیفہ خور بن گیا تھا اور اسی وظیفہ کو استعمال کر کے زندگی گزار رہا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا اقتدار صرف لال قلعہ کی چہار دیواری کی حد تک محدود ہو گیا تھا۔ ڈلہوزی نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے بعد بادشاہ کا ادارہ اور لقب مکمل طور پر ختم کر دیا جائیگا اور بادشاہ کی اولاد کو لال قلعہ خالی کر دینا ہوگا۔ اس تجویز نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمانوں کے جذبات کو اس سے سخت ٹھیس پہنچی کیونکہ بادشاہت کا ادارہ ہی ان کی عظمت رفتہ کی واحد یادگار طور پر باقی تھا۔ اودھ پر قبضہ کر کے انگریزوں نے مسلمانانِ اودھ اور سارے برصغیر کے مسلمانوں کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا جس کی وجہ سے ایک چھوٹی سی فوجی بغاوت اچانک مکمل جنگ کی صورت اختیار کر گئی اور شہزادے، زمیندار، مذہبی رہنما، اور کسان اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح لارڈ ڈلہوزی نے نانا صاحب کے پیشوا کے لے پالک بیٹے کا وظیفہ بند کر دیا جس پر چراغ پا ہو کر وہ انگریزوں کا شدید دشمن ہو گیا۔

معاشی اسباب

نو آبادی نظام کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یورپی اقوام کی صنعتی ترقی کیلئے نو آبادیات سے سستے داموں خام مال خریدا جائے اور پھر ان سے تیار کی گئی صنعتی اشیاء کو واپس نو آبادیاتی منڈیوں میں فروخت کر کے کثیر منافع کمایا جا سکے۔ اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار جس قدر وسیع ہوتا گیا اس نے مقامی سوتی اور ریشمی پارچہ کی صنعتوں کو تباہ کر دیا اور مقامی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے سوتی اور ریشمی پارچہ کی درآمد ناگزیر ہو گئی اور برصغیر نے ان کی ایک عالمی منڈی کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس سے مقامی سوتی اور ریشمی پارچہ سازی کی صنعتیں بند ہو گئیں اور شہروں میں بے روزگاری عام ہوئی لوگ شہروں سے دیہاتوں کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن کمپنی نے بھاری زرعی ٹیکسوں کے اطلاق سے کاشتکاروں کو بھی تباہی کے دہانہ تک پہنچایا۔ زرعی محصولات کی عدم ادائیگی کی صورت میں انگریز حکومت کسانوں اور زمینداروں سے زمین ضبط کر کے اسے فروخت کر دیتی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسان اور زمیندار بھی محتاج ہو گئے۔ سرزمین ہند جو انگریزوں کی آمد سے پہلے سونے کی چڑیا کہلاتی تھی اس میں قحط سالی سے وبائی امراض کی وجہ سے لاکھوں انسانی جانیں تلف ہو گئیں۔

کمپنی کی مالیاتی پالیسی کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ ہندوستانی محصول دہندگان کو نہ صرف اپنے علاقہ کی انتظامیہ کا خرچ برداشت کرنے اور انگریزوں کی توسیع پسندی کی خاطر لڑی جانے والی لڑائیوں کیلئے اخراجات کا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا بلکہ انہیں کمپنی کے حصص داروں (شیئر ہولڈرز) کیلئے منافع کی ادائیگی کے سلسلہ میں رقم کی ادائیگی کرنا پڑتی تھی لیکن چونکہ ہندوستان سے بھیجا جانے والا پیسہ اس مقصد کیلئے ناکافی ثابت ہوتا تھا اس لئے عوام الناس پر ایک اضافی قرضہ لاگو ہو گیا جس کو "پبلک ڈیبٹ آف انڈیا" (ہندوستان کا عوام قرضہ) کا نام دیا گیا جس سے محصول دہندگان پر ان قرضوں کی ادائیگی کے علاوہ اس کے سود کا بوجھ بھی پڑنے لگا۔ یہ ہندوستانی مالیاتی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

مذہبی اسباب:

ہندوستانیوں کی بے چینی کا ایک اہم سبب عیسائی مشنریوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں تھیں ابتداء میں کمپنی کی حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی لیکن اس کے مذہبی خیالات رکھنے والے افسروں نے ان سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔ بعد میں حکومت نے اپنی پالیسی تبدیلی کر لی اور چاپلین، بشپ اور آرچ بشپ مقرر کئے۔ عیسائی مذہب قبول کرنے والوں کیلئے نئے قوانین وضع کئے گئے تاکہ ان کی موروثی جائیداد سے انہیں محروم نہ کیا جا سکے اس کے علاوہ انہیں دولت اور پروقار معاشرتی ترغیبات فراہم کی گئیں۔ علاوہ ازیں مشنریوں کو اسکول اور کالج کھولنے کے مواقع فراہم کئے گئے۔ وہ ہندو اور مسلم اجتماعات اور میلوں میں جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرنے لگے۔ مشنری کالجوں اور اسکولوں کے قیام کے علاوہ حکومت نے مغربی تعلیم کو عام کرنے کی پالیسی بنائی۔ علاوہ ازیں 1845ء میں قیدیوں کیلئے جن کا مختلف مذاہب سے تعلق تھا مشترکہ خورد و طعام کا انتظام (میس) قائم کیا گیا جس سے سارے ہندوستانیوں کے مذہبی احساسات مجروح ہوئے کیوں کہ وہ مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

فوجی اسباب:

ان تمام اسباب کے علاوہ برطانوی فوج میں کام کرنے والے ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں بھی حد سے تجاوز کر گئی تھیں۔ فوجی انتظامیہ میں کئی بحق حالات پیدا ہو گئے تھے مثلاً ایک انگریز سپاہی کی تنخواہ مقامی سپاہی کی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ہندوستانی سپاہیوں کے حوصلے بہت پست تھے کیوں کہ ترقی کے عرصہ ملازمت کی طوالت (سنیارٹی) کو طوالت کو معیار بنایا تھا اور لائق فوجی افسروں کو فوج سے ہٹا کر سول عہدوں پر مامور کیا جاتا تھا۔ مقامی سپاہی اس قسم کے امتیازات کے لئے۔ برطانوی سپاہی کو ملازمت سے 70 سال کی عمر میں سبکدوش کیا جاتا تھا جبکہ ہندوستانی سپاہی کیلئے یہ عمر 55 سال مقرر تھی۔ مقامی فوجیوں کی بے چینی میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب مستقل طور پر توسیع پسندی کیلئے سرحدی جنگوں کا آغاز ہوا اور مقامی سپاہیوں کو اس میں بلا کسی اضافی الاؤنس کے شرکت کرنے کا پابند بنا دیا گیا۔ سروس انلسٹ منٹ" کا قانون 1856ء میں منظور کیا گیا جس کے تحت ہندوستانی سپاہیوں کو پابند کیا گیا کہ جہاں ضرورت ہو انہیں وہاں (جنگ کیلئے) جانا ہوگا۔ افغانستان کے خلاف جنگوں میں ہندوستانی سپاہیوں کو دور دراز علاقوں میں لڑنے کیلئے بھیجا گیا۔ ہندوستانی فوجوں میں برہمن اور راجپوتوں کی تعداد زیادہ تھی ان میں کا یہ خیال تھا کہ سمندر عبور کرنے سے اور برصغیر کے باہر جانے سے ان کی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ ان تمام عوامل کے یکجا ہو جانے سے فوج میں بے چینی اور بغاوت کی پیدا ہوئی۔ جنوری 1857ء میں فوج نے ایک نئی قسم کی رائفل ان کیلئے متعارف کروائی گئی جس میں استعمال ہونے والے کارتوسوں پر گریس لگی ہوئی تھی اور ان کے سے قبل ان کے ایک سرے کو دانت سے کاٹنا پڑتا تھا ان کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ گریس گائے اور سور کی چربی سے بنی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک جانور ہندو کیلئے مقدس تھا اور دوسرا مسلمانوں کیلئے حرام تھا۔ اس لئے اونچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں سے سخت اشتعال پھیل گیا۔ اس کے بعد نئے کارتوسوں پر پابندی لگا دی مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرٹھ میں فوجیوں نے جب ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا تو انہیں کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر 9 مئی 1857ء کو 10 قید بامشقت کی سزا سنائی گئی اور انہیں عوام الناس کے سامنے ذلیل کیا گیا۔

جنگ آزادی میں ناکامی کے اسباب:

جنگ آزادی میں ناکامی کے اسباب بڑے واضح نوعیت کے حامل تھے۔ دنیا میں مناسب منصوبہ بندی، جنگی وسائل، باہمی روابط اور تنظیم کے بغیر کسی جنگ میں کامیابی نہیں سکتی۔ پھر یہ جنگ تو ایک بڑی طاقت اور ایک پسماندہ قوم کے ایک محدود طبقہ کے درمیان لڑی گئی۔

جنگ کی محدود علاقائی نوعیت: جنگ آزادی دراصل شمالی ہندوستان کے ایک محدود علاقے اور عوام کے چند طبقات کی طرف سے لڑی گئی۔ ہندوستان کے ایک بڑے علاقے اور اس کی آبادی اور کئی مقامی حکمرانوں نے اس سے لاتعلقی برتی خصوصاً دریائے نربدا کا جنوبی علاقہ، سندھ، پنجاب، سرحد اور راجپوتانہ مکمل طور پر انگریزوں کے وفادار رہے۔ مرہٹے جو ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے بھی دشمن بنے ہوئے تھے اس جنگ آزادی میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دینے سے قاصر رہے۔

اہلیت کا فقدان: اس جنگ میں کے دوران مقامی افواج کیلئے اچھے فوجی جرنیل دستیاب نہ تھے۔ ان کے پاس کوئی ماہر منصوبہ بندی کرنے والے موجود نہ تھے۔ سیاسی گٹھ جوڑ سے واقف حضرات کی کمی تھی جس کے باعث انہیں صحیح اور کارگر قیادت نصیب نہ ہوئی صرف جنرل بخت خان ہی وہ واحد جنرل تھا جس نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن وہ بھی تمام مقامی افواج کا سپہ سالار نہ تھا اور دوسرے شہزادوں کی فوجی نااہلیت کی وجہ مقامی فوج منظم نہ ہو سکی۔ جھانسی کی رانی ذاتی طور پر بڑی بہادر تھی لیکن بھی ایک باصلاحیت فوجی جرنیل ثابت نہ ہو سکی۔ مغل فوج کی سربراہی نالائق اور کم ہمت شہزادوں کی کمان میں تھی۔ یہ جنگ بغیر کسی منصوبہ بندی کے شروع کی گئی اور جنگلی جانوروں کے غول کی شکل میں یہ انگریزوں پر حملہ آور ہوئی جس کا منطقی نتیجہ شکست کی شکل میں رونما ہوا۔ دوسری طرف انگریز افواج کو ہڈسن، سر ہنری لارنس، سر کولن کیمپ بیل، ہیولاک اور نگ روز جیسے لائق فوجی جرنیلوں کی خدمات حاصل تھیں انہوں نے بڑے منظم انداز میں مختلف تکنیکی مہارتوں کو استعمال کرتے ہوئے مقامی فوجوں کو شکست فاش دی۔ ان کی جنگی حکمت عملیاں ہندوستانیوں سے بہت ہی زیادہ جدید اور بہترین تھیں۔

جدید جنگی ہتھیاروں کی کمی (عدم دستیابی): تکنیکی نقطہ نظر سے اس جنگ میں جنگی ہتھیاروں کے استعمال کے معاملہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہندوستانیوں نے یہ جنگ تلواروں اور نیزوں جیسے قدیم اور فرسودہ ہتھیاروں سے لڑی۔ عملی طور پر انگریزوں کے جدید اور کثیر مقدار میں آتشیں اسلحہ کے مقابلہ میں ہندوستانی تقریباً غیر مسلح تھے۔ جو کچھ انگریزوں سے چھینا تھا وہ چند روز کی لڑائی میں استعمال ہو گیا جب کہ دوسری طرف انگریزی سپاہ کو اسلحہ اور گولہ بارود کی مستقل فراہمی جاری رہی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سمندر پر انگریزوں کا پوری طرح تسلط تھا۔ چنانچہ اس لئے وہ یہ صلاحیت رکھتے تھے کہ بلا کسی مشکل کا سامنا کئے ہوئے وہ بڑی تعداد میں فوجی اور رسد ہندوستان پہنچا سکتے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے بہت بڑی تعداد میں افواج کو فی الفور ہندوستان بھیج دیا ہندوستانی جو فرسودہ ہتھیاروں سے لڑ رہے تھے وہ کسی طرح بھی برطانوی افواج کا

مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے جن کے پاس این فیلڈ نامی (جدید ترین) رائفلیں تھیں۔

اتحاد اور مالی وسائل کی کمی: جنگ کے دوران مہاجنوں (روپیہ قرض دینے والوں) کو دیہاتیوں نے اپنے حملوں کا ہدف بنا رکھا تھا۔ کسانوں اور کاشتکاروں نے مالگذاری کی آمدنی اور مہاجنوں کے حسابی کھاتوں تلف کر دیئے تھے۔ اس لئے مہاجن جنگ آزادی کے سخت خلاف ہو گئے پھر رفتہ رفتہ تاجر برادری نے بھی غیر دوستانہ رویہ اپنا لیا کیونکہ باغی لوگوں نے جنگی اخراجات کا بوجھ برداشت کرنے کیلئے ان لوگوں پر محصولات کا بوجھ بڑھا دیا تھا۔ تاجروں کے پاس موجود غلے کے اسٹاک کو فوجیوں نے اکثر اپنی دولت اور سامان تجارت کو چھپانا شروع کر دیا اور باغی فوجیوں کو مفت اناج کی رسد فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ بنگال کے زمیندار (جو اکثر ہندو تھے) برطانوی لوگوں کے وفادار رہے۔ بہار میں کسانوں کی زمینداروں سے مخالفت کو دیکھ کر بنگالی زمیندار خوفزدہ ہو گئے تھے۔ بمبئی مدراس اور کلکتہ بڑے تاجروں نے بھی برطانیہ کا ساتھ دیا کیونکہ ان کا اصل منافع غیر ملکی تجارت اور برطانوی تاجروں سے معاشی تعلقات پر منحصر تھا۔

باہمی رقابتیں: جنگ آزادی کے قائدین آپس میں ایک دوسرے سے رابطہ اور تعاون رکھنے کے بجائے بغض وعناد رکھتے تھے اور اکثر ان میں چپقلش اور جھگڑے ہو جاتے تھے۔ اودھ کی بیگم اور مولوی احمد اللہ کے مابین ہمیشہ مخالفت رہی، مغل شہزادے مرزا مغل نے حتی الامکان جنرل بخت کو پریشان کیا، نانا صاحب کے مشیر اسے دلی جانے سے روکتے رہے تاکہ اسے مغل بادشاہ کی ماتحتی نہ قبول کرنی پڑے۔ اس کے علاوہ کچھ شاہی مشیر اور درباری حضرات انگریز کے جاسوس بھی گئے تھے۔ قائدین کی خود غرضی اور مفاد پرستی نے اس جنگ میں ناکامی کو یقینی بنا دیا تھا۔

صحیح سمت کا فقدان: باغی انگریزوں سے نفرت کے جذبہ کے تحت ایک پرچم تلے جمع ہو گئے تھے اور جب ایک علاقے سے برطانوی طاقت کا انخلاء ہو جاتا تھا تو یہ بات ان کے لئے ناقابل فہم ہو جاتی تھی کہ اس انخلاء کو کس طرح پُر کیا جائے یعنی انگریزوں کو بےدخل کرنے کے بعد ان کی جگہ متبادل علاقائی انتظامات کرنے کی ان میں صلاحیت موجود نہ تھی کیونکہ اس سلسلہ میں انہوں نے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ ایک جدید اور ترقی پسند منصوبہ کی عدم موجودگی اور شہزادوں اور زمینداروں کی خود غرضی اور نااہلی نے فوجوں میں عدم اطمینان اور نظم وضبط کا فقدان پیدا کر دیا تھا۔

رائج نظام کی کمزوریاں: ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام رائج تھا جب کہ انگلستان میں سرمایہ دارانہ نظام پر عمل ہوتا تھا۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام میں لوگ ہمیشہ جاگیردارانہ نظام کے مقابلے میں سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی اعتبار سے زیادہ مستحکم حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں وسائل کا ارتکاز چند ہاتھوں میں نہیں ہوتا اور جاگیردارانہ نظام کے مقابلہ میں لوگ زیادہ آزاد اور باشعور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام میں حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات زیادہ قوی ہوتے ہیں جب کہ مقابلتاً جاگیردارانہ نظام میں افراد سماجی طور پر منتشر اور سیاسی شعور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس نظام میں سیاسی اختیارات اور معاشی وسائل چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی فتوحات کی تاریخ میں شاید ہی کسی برطانوی کا نام ملے جس نے اپنی قوم سے غداری کی ہو جب کہ ہندوستان کی تاریخ اور سیاسی نظام میں ہر طبقے میں غداری کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ شہزادے، عوام، جنرل اور تاجر لوگوں میں ایسے سینکڑوں افراد موجود تھے جنہوں نے برطانیہ کے مفادات کے لئے کام کیا اور انگریزوں کو ہندوستان پر قبضہ کرنے میں مدد فراہم کی۔

جنگ کے بعد مسلمانوں کے حالات

1857ء کی جنگ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کیلئے ایک سانحہ عظیم ثابت ہوئی جس نے بالآخر مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں تباہی و پسماندگی سے دوچار کر دیا۔ ہر میدان میں مسلمانوں کی بالادستی ختم ہوگئی اور وہ انگریزوں کے رحم وکرم کے محتاج ہو گئے۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی طرح طرح کے مسائل میں مبتلا ہوگئی اور انگریزوں کے معاندانہ رویہ نے انہیں مزید پسماندگی میں دھکیل دیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں انگریزوں نے مسلمانوں کے مفادات کو تباہ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔

سیاسی حالات: 1857ء کے بعد ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا کردار تقریباً ختم ہوگیا۔ اس سے قبل وہ ایک ایسی قوم تھے جس کا ایک عظیم سیاسی ورثہ تھا لیکن اب ان کا سیاسی مستقبل تاریک ہوگیا تھا وہ بڑی تیزی سے شدید غربت، معاشی اور معاشرتی مسائل میں گھر گئے۔ 1857ء تک مسلمان خود کو برصغیر کا آقا سمجھتے تھے اس لئے نئے سیاسی ڈھانچے کو قبول کرنا بلکہ اس کو برداشت کر لینا بھی ان کیلئے نہایت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ انگریزوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اپنی حکومت کو توسیع دینے کیلئے مسلمانوں کو تباہ کرنا ضروری ہے۔

معاشی حالات: مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت اس قابل نہ رہی کہ وہ سادہ غذا خرید کر اپنے جسم وروح کا رشتہ برقرار رکھ سکتی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ان کی

مشکلات میں دن بدن اضافہ ہونے لگا سیاسی زوال اور مالی دیوالیہ پن مسلمانوں کا مقدر بن گئے۔ انگریزوں کا ان مالی مشکلات کے پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ تھا۔ زمینداروں کی بے دخلی اور ان کی جاگیر کی ضبطی سے مسلمانوں کو بہت بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہندوؤں نے بھی

معاشرتی حالات: مسلمانوں کو تمام سماجی حلقوں سے بے دخل کر دیا گیا اور یہ کام انگریزوں نے انجام دیا اور پھر بدلتے ہوئے حالات میں ہندوؤں نے بھی اہمیت دینا بند کر دیا۔ دراصل سیاسی طاقت، معاشیات اور تعلیم وہ عوامل ہوتے ہیں جس سے کسی فرد یا طبقہ کے معاشرتی مقام کا تعین ہوتا ہے۔ مسلمان جن پر جدید دروازے بند کر دیے گئے تھے وہ سیاسی طور پر تباہ ہوئے اور معاشی طور پر دیوالیہ ہو گئے۔ ان کی معاشرہ میں حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کیلئے محتاج ہو گئے۔ مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال ہندوستان پر حکومت کی اور اس اثناء میں وہ ہندوؤں کے مذہب، روایات اور ثقافتی اقدار کو تحفظ فراہم کرنے عقیدہ مساوات پر عمل پیرا رہے۔ مسلمان حکمرانوں نے کبھی ہندوؤں کے ان کے حقوق سے محروم نہیں کیا لیکن بدلے ہوئے حالات میں ہندو مسلمانوں کو ان کا جائز مقام دینے سے انکار کرنے لگے۔ یہ وہ حالات تھے جس میں مسلمان قائدین نے مسلمانوں کو ان کی عظمت عہد رفتہ کی تجدید کیلئے اکسانا شروع کر دیا اور مسلم تحریک کی ابتداء ہوئی۔

فوج کی تنظیم نو: ہندوستانی فوج میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں اور تنظیم نو کا پروگرام متعارف کرایا گیا۔ فوج میں بنگالیوں کی بھرتی کو کم سے کم کر دیا گیا۔ مدراس بنگال کی فوجوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا گیا کیونکہ ہر گروپ کی علیحدہ روایات اور تشخص نے جنگ کے جراثیم کو بنگالی فوج سے دیگر افواج تک پھیلنے سے روکنے میں اہم تھا۔ فوج کی تنظیم نو اسی طرح کی گئی کہ ہندوستانیوں میں قومی یکجہتی کا احساس ختم ہو جائے اور قبائلی اور فرقہ وارانہ وفاداریاں اہمیت کی حامل ہو جائیں۔ فوج کو ہندو سے علیحدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کو بروئے کار لایا گیا۔ یہاں تک کہ اخبارات کو فوج سے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پوری ہندوستانی فوج کو کمیونٹی رجمنٹ کی بنیادوں گیا۔ یوپی کے لوگوں کو فوج میں کم سے کم کر کے ان کی جگہ گورکھا، سکھ، جاٹ مرہٹہ اور پنجاب کی رجمنٹیں بنائی گئیں۔ فوج میں بھرتی کیلئے نئے معیار مقرر کئے گئے جس جنوبی ہند کے لوگوں کا فوج میں داخلہ بند کر دیا گیا اور ان کی جگہ پنجاب اور سرحد سے بھرتی شروع کی گئی کیونکہ یہ علاقے جنوبی ہند کے مقابلے میں جنگ آزادی کے انگریزوں کے وفادار ثابت ہوئے تھے۔ تمام اہم فوجی عہدے انگریز قومیت کے لوگوں کے سپرد کئے گئے ہندوستانی فوجیوں کو کمیشن (اعلیٰ فوجی عہدے) نہیں دیئے جاتے مزید تحفظ کیلئے ہندوستانی فوجوں کو زیادہ مؤثر اور جدید جنگی ہتھیار نہیں دیئے جاتے تھے۔

ہندو مسلم اتحاد میں خلیج: اس جنگ کے بعد ہندو مسلم اتحاد کے خاتمے کیلئے انگریزوں نے باقاعدہ حکمت عملی اپنائی ویسے بھی اس جنگ کی ناکامی نے دونوں قوموں میں فہمیاں پیدا کر دی تھیں۔ اگرچہ جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں نے شرکت کی تھی لیکن مصلحتاً انگریزوں نے اس کا سارا الزام مسلمانوں پر لگایا اور مسلمانوں کو زندگی میں پسماندہ رکھنے اور ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کرنے کا طریقہ کار اپنایا۔ مسلمانوں کے بیشتر دانشور اور اکابرین و زعماء کو یا تو پھانسی دے دی گئی یا انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔ 16 نومبر 1857ء کو لگ بھگ 24 مسلمان شہزادوں کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ مسلمان جاگیرداروں سے جاگیریں چھین لی گئیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کو بے روزگار کر دیا گیا جب کہ اس کے برعکس سیاسی، سماجی اور معاشی میدان میں انگریزوں کی ہمت افزائی اور سرپرستی کے نتیجہ میں ہندوؤں نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرنا شروع کر دی۔ اس طرح ہندو اور مسلمانوں میں معاشرتی تفاوت تیزی سے بڑھتا گیا نتیجتاً ہندو اور مسلمانوں کے مابین فاصلے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ فاصلے 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے تصور کا خاتمہ: اس جنگ سے قبل مسلمانوں میں عام طور پر نشاۃ الثانیہ کی جو امیدیں یا تصورات فروغ پا رہے تھے وہ جنگ کی ناکامی کے باعث سرے سے مٹ گئے۔ مسلمانوں کی فکری اور ثقافتی سرگرمیاں ختم ہو گئیں جبکہ اسکے برعکس کلکتہ ہندوؤں کی نشاۃ الثانیہ کے مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔

1857ء کے بعد سر سید احمد خان کی خدمات

سر سید احمد کان ہندوستا میں مسلم حکومت کی ناکامی کے بعد خضر راہ بن کر ابھرے۔ ہندوستان کے مسلمان 1857ء کے بعد معاشرتی، معاشی اور اقتصادی مایوسیوں سے دوچار ہو گئے۔ معاشرتی اور سیاسی طوفان کے اس اندھیرے میں سر سید احمد خان روشن تارے کی طرح مسلمانوں کو سیدھا راستہ دکھانے اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے، انھوں نے کافی سوچ و بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ انگریزوں کو اس ملک سے اس وقت تک نہیں نکالا جا سکتا جب تک مسلمان ان کی تہذیب کو اپنا کر جدید علوم کے حصول کے لئے تیار نہیں ہو جاتے، چنانچہ آپ نے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان باہمی اتفاق کا راستہ ہموار کیا اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

ایک منظم تحریک چلائی۔

سرسید احمد خان کی خدمات تحریک علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوئیں اس تحریک نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا۔اس تحریک نے سیاسی، تعلیمی، معاشرتی اور مذہبی پہلوؤں کو اس قدر اجاگر کیا کہ یہی پہلو بعد میں تحریکِ پاکستان کا سبب بن گئے۔

1857ء کے بعد مسلمانوں کا سیاسی ارتقاء اور علی گڑھ تحریک:

سرسید احمد خان 17 اکتوبر کو ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد بہادر شاہ ظفر کے بہت قریبی حلقے سے تعلق رکھتے تھے، وہ ایک زاہد و عابد اور صوفی منش انسان تھے۔سرسید احمد خان نے ابتدائی تعلیم خاندان میں ہی حاصل کی، فارسی اور عربی کا بہت شوق تھا اس لئے دونوں زبانوں میں کافی مہارت حاصل کر لی۔1838ء میں سرسید کے والد کا انتقال ہو گیا اس وقت ان کی عمر تقریباً 22 برس تھی چنانچہ والد کے انتقال کے بعد ان کو ملازمت کی فکر لاحق ہوئی۔آخر کار وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے صدر امین کے عہدے پر پہنچے۔1842ء میں آپ نے منصفی کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔1842 میں آپ کو دہلی میں جج کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔سرسید احمد کیونکہ بہادر شاہ ظفر کے بہت قریب تھے اس لئے انہیں جوادالدولہ اور عارف جنگ کا خطاب عنایت کیا گیا۔ان کی خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے ان کو سر کا خطاب دیا۔

سماجی خدمات: سرسید احمد خان نے حاکم اور محکوم کے رشتہ کو بہترین بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے 1858ء میں "اسباب بغاوت ہند" کتاب لکھی۔

اسبابِ بغاوت: 1857ء میں سرسید احمد خان نے ایک کتاب اسبابِ بغاوت ہند لکھی۔اس کتاب میں انہوں نے انگریزوں کو بتایا کہ غدر ایک سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا بلکہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو اس سلسلے میں اکسایا اور یہ کہ اس میں حکومت برطانیہ کی بھی بہت سی غلطیاں تھیں جن کی بناء پر ہندو اور مسلمان دونوں مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔چنانچہ مایوسی نے انہیں انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکسایا ورنہ مسلمان کبھی بھی غدر میں حصہ نہ لیتے اس کتاب کے شائع ہونے سے انگریزوں کے شکوک کافی حد تک دور ہو گئے۔

ہندوستان میں وفادار مسلمان: انگریزوں کے دلوں میں یہ احساس پوری طرح بیٹھ گیا تھا کہ مسلمانوں نے غداری سے کام لیا ہے انگریزوں کے ان شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے سرسید احمد خان نے ایک اور کتاب لکھی جس میں اس بات کا جائزہ لیا گیا تھا کہ جنگ آزادی کے ذمہ دار صرف مسلمان نہیں، بلکہ یہ جنگ ان مایوسیوں اور ناانصافیوں کا نتیجہ تھی جن سے ہندوستان کے باشندے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں دوچار رہے۔اس کتاب کا نام ہندوستان میں وفادار مسلمان تھا۔

تہذیب الاخلاق: معاشرہ میں پھیلی ہوئی رسوم ختم کرنے کیلئے سرسید نے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام تہذیب الاخلاق تھا اس رسالے میں معاشرتی اصلاح کیلئے مختلف مضامین لکھے جاتے تھے۔سماجی خدمات میں تہذیب الاخلاق نے اہم کردار ادا کیا اس رسالہ کے ذریعے ہندوستان کے باشندوں کے درمیان یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

تعلیمی خدمات: سرسید احمد خان کو اس بات کا یقین تھا کہ جدید تعلیم کے حصول کے بغیر مسلمان ہندوؤں اور انگریزوں کی برابری نہیں کر سکتے۔اقتدار حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کر دی تھیں۔عربی اور فارسی کو نصاب سے خارج کر دیا تھا اور انگریزی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ان تمام اقدامات کو مسلمان اپنے مذہب اور عقائد کے خلاف سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں نہیں بھیجا اس طرح انگریزی تعلیم کی مخالفت کی وجہ سے ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔

سرسید کے نزدیک انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا تھا۔لیکن یہ خود مسلمانوں کی غلطی تھی کہ وہ جدید علوم کی طرف راغب نہیں ہو رہے تھے، چنانچہ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف راغب کرنے کے لئے ایک تعلیمی تحریک شروع کی، اسی تحریک نے بعد میں علی گڑھ تحریک کا روپ دھار لیا۔تعلیمی خدمات کے سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مختلف علاقوں میں مدرسے اور اسکول قائم کرنا شروع کر دیئے اس سلسلے میں ان کے اقدامات یہ تھے

۱۔ 1859ء میں سرسید نے مراد آباد میں پہلا مدرسہ قائم کیا۔

۲۔ 1862ء میں غازی پور میں وکٹوریہ اسکول قائم کیا۔

۳۔ 1857ء میں علی گڑھ میں ایم۔اے۔او اسکول قائم کیا۔

۴۔ 1877ء میں ایم۔اے۔او اسکول کا درجہ بڑھا کر کالج کر دیا گیا۔

ان تمام مدارس میں سرسید احمد خان نے انگریزی تعلیم لازم قرار دی۔1877ء میں وائسرائے ہند لارڈ مٹن نے علی گڑھ کا سنگِ بنیاد رکھا تو تھوڑے عرصے

Lecturer Shaikh Asif Zahoori

مسلمانوں کی اہم درسگاہ بن گیا۔ اس کالج میں نہ صرف جدید علم کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ مذہب اور دینیات کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ دی گئی تا کہ مسلمانوں کے ذہن سے نکالا جائے کہ مغربی تعلیم اسلامی اصولوں کے منافی نہیں ہے۔ سائنس کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے سرسید احمد خان نے قلمی میدان میں بے شمار خدمات انجام دیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام: مسلمانوں کی ذہنی اور فکری آبیاری کے لئے سرسید احمد خان نے 1862ء میں غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اس سوسائٹی کے زیر نگرانی بے شمار انگریزی زبانوں کی کتابوں کا انہوں نے جدید علوم کے اردو تراجم کرائے اور ان تراجم کو چھاپنے کے لئے چھاپہ خانہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے ساتھ اس سوسائٹی نے اعلیٰ تہذیبوں پر بھی کام کیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں کو سائنسی علوم کی طرف راغب کیا۔ یوں تو اس سوسائٹی نے بے شمار دیئے لیکن اس سوسائٹی کا سب سے بڑا کارنامہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء تھا۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ: 1866ء میں سرسید احمد نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شائع کرنا شروع کیا، یہ اخبار اس مقصد کے لئے جاری کیا گیا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستانی مسائل سے روشناس کرایا جائے اور ہندوستانیوں کو انگریزوں کے تہذیب و تمدن کے قریب لایا جائے اس اخبار کے ذریعے سرسید احمد انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات سے آگاہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس اخبار میں انگریزوں کی زیادتیوں اور معاشرتی استحصال پر بھی نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ بعد ازیں اس اخبار میں اخلاقی سیاسی مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے مجموعی طور پر اس اخبار کی نوعیت سیاسی تھی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس: 27 دسمبر 1886 کو سرسید احمد خان نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد دور دراز کے علاقوں کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا اس کانفرنس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا جس میں اس کے مقاصد اس طرح طے ہوئے۔

۱۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔

۲۔ مشرقی علوم اور دینی تعلیم کو تقویت دینا اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۳۔ ایسے تعلیمی ادارے جہاں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے ان کو ہر قسم کی مشکلات سے نکال کر مستحکم کرنا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط پلیٹ فارم پیدا کر دیا اسی کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں 1906ء میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اس طرح محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔

سیاسی خدمات: سرسید احمد خان وہ پہلے سیاستدان ہیں جنہوں نے ہندوستان کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کئے انہوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ ہندو اور مسلم یکجا نہیں رہ سکتے کیونکہ دونوں کا مذہب، تہذیب و تمدن ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابتداء میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنی پوری توجہ مغربی علوم کی تعلیم پر دیں اور سیاست سے پرہیز کریں۔ سیاسی خدمات کے سلسلے میں دو قومی نظریہ پیش کرنے اور ہندی و اردو زبان کا جھگڑا طے کرنے میں ان کا کردار اہمت کا حامل ہے۔

اردو ہندی جھگڑا: سرسید کا دوسرا سیاسی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے تشخص کو ابھارنے کے لئے اردو زبان کو اپنی زبان قرار دیا اور اردو زبان، فارسی، عربی اور بہت سے زبانوں کے ملاپ سے وجود میں آئی اور انیسویں صدی کے آخر تک اس نے کافی ترقی کر لی لیکن 1867ء میں بنارس کے ہندوؤں نے ایک تحریک چلائی کہ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی جگہ ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط رائج کیا جائے۔ دفتروں اور عدالتوں میں اردو کی جگہ ہندی اور اس کے رسم الخط کو استعمال کیا جائے۔ سرسید نے اس سلسلے کو روکنے کے لئے بہت جدوجہد کی اور ہندوؤں کے اس ناپاک ارادہ کو روکنے کے لئے 1873ء میں الہ آباد میں اردو ڈیفنس سوسائٹی قائم کی اور اس کی شاخیں ہندوستان کے تمام شہروں میں قائم کر دیں۔ اس طرح سرسید کی کوشش سے اردو زبان پنپتی رہی اور آج یہی پاکستان کی قومی زبان ہے۔

دو قومی نظریہ: شروع شروع میں سرسید احمد خان ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے لیکن 1868ء کے بعد ہندوستان میں ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے نہ صرف سرسید کی زندگی اور اندازِ فکر کو بدلا بلکہ ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے پرزور الفاظ میں اس نظریہ کی وضاحت کی اور یہ بات واضح کر دی کہ ہندو اور مسلم ایک قوم نہیں ہو سکتے بلکہ دونوں علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ اس بات کے پیشِ نظر سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا اور ان کو بتایا کہ ہندو کبھی بھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے چنانچہ ان کے دو قومی نظریہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کو ابھار کر ہندوستان کی سیاست کا رخ موڑ دیا۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

مذہبی خدمات: جدید علم کی ترویج کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خان نے مذہبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا انہوں نے بے شمار مذہبی مضامین لکھے اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے بہت سی مذہبی کتابیں بھی مرتب کیں۔ اس سلسلے میں ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔

۱۔ خطباتِ احمدیہ

۲۔ قرآن مجید کی تفسیر۔

۳۔ رسالہ طعام اہلِ کتاب۔

خطباتِ احمدیہ: یہ کتاب سرسید نے سر ولیم مور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں لکھی اور سر ولیم مور کے اعتراضات کو جواب دیا۔ ولیم مور نے حضور ﷺ پر جو اعتراضات کئے تھے ان کا سرسید نے نہ صرف منہ توڑ جواب دیا بلکہ برطانوی حکومت کو معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سرسید کا ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جاتا رہے گا۔

قرآن کی تفسیر: سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لئے قرآن مجید کی سات جلدوں کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے اسلام کو عقل اور سائنس کی روشنی میں پرکھا۔ شاید ان کو کوشش سے بعض علماء اور بزرگانِ کرام ان سے ناراض ہو گئے۔ بہرحال ان کی اس تفسیر نے عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں بہت کام کیا۔

تبیین الکلام: 1857ء سے پہلے مشنریوں کے کاروبار زیادہ پھیلنے لگے اور مسلمانوں کے ساتھ جابجا ان کے مناظرے ہونے لگے۔ سرسید نے اسلام کی حمایت میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات "تبیین الکلام" کے نام سے لکھے۔ یہ رسالہ بائبل کی تفسیر ہے اس میں قرآن و حدیث سے بائبل کے اصولوں سے مطابقت کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرسید کا مطلب یہ تھا کہ اصولِ اسلام اور اصولِ اہلِ کتاب میں جہاں تک ممکن ہو سکے مطابقت ثابت کی جائے اور جہاں جہاں اختلافات پائے جائیں وہاں اختلافات کی وجہ بیان کر دی جائے تا کہ اسلام کے متعلق عیسائیوں کی بدگمانیاں دور کی جا سکیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک اور رسالہ "طعام اہلِ کتاب" کے عنوان سے لکھا جس میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا کہ مسلمان عیسائیوں کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھا سکتے ہیں اور ایک دوسرے کو دعوت دے سکتے ہیں۔ اس کتاب نے عیسائیوں کے شکوک کافی حد تک ختم کر دیئے۔ الغرض سرسید احمد خان نے افلاس عام کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی مسلم قوم کو اس وقت سہارا دیا جب اس کی ترقی اور بیداری کے تمام راستے بند تھے۔ چنانچہ سرسید نے مسلم ملت کو مغربی تعلیم کے ذریعے عہدِ جدید میں داخل کر دیا اور اسے پسماندگی سے نکال کر ترقی کے راستے پر لگا دیا تا کہ وہ تیزی کیساتھ بدلنے والی دنیا کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ سرسید نے اپنی قوم کی سیاست، ثقافت، ادب اور مذہبی تفکر پر اثرات مرتب کئے اور ہر میدان میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

تحریک علی گڑھ اور اسکے تعلیمی و سیاسی اثرات

سرسید احمد خان مسلمانوں کے سیاسی، مذہبی ادبی اور سماجی رہنما تھے۔ وہ ہماری قومی اور ادبی تاریخ کی نامور شخصیت تھے کہ انہیں انیسویں صدی کا عظیم مصلح اور مسیحا سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکال کر ساحلِ مراد تک پہنچانے کا پروگرام بنایا اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لئے جدید علوم کی طرف راغب کیا۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سرسید نے علی گڑھ میں ایک ایسے تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی جو ان کی زندگی ہی میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کی سب سے بڑی تحریک بن گیا۔

تحریک علی گڑھ کا نقطۂ نظر: 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد سرسید کی عاقبت اندیش نگاہوں نے مستقبل کو دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار انگریزوں کی بغاوت میں نہیں بلکہ ان کے علوم سیکھنے میں ہے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کیلئے شب و روز انتھک محنت کی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کیلئے تعلیمی منصوبہ بنایا۔ انکا یہی منصوبہ تاریخ میں تحریک علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو تحریک علی گڑھ کا باعث بنا۔

تحریک علی گڑھ اور عملی اقدامات (تعلیمی پہلو): سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس ارادے کا اظہار کرنے سے پہلے انہوں نے انگریزوں کے دلوں سے یہ احساس دور کیا کہ مسلمان غدار نہیں بلکہ وہ وفادار ہیں اس سلسلے میں سرسید احمد خان نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" اور "ہندوستان میں وفادار مسلمان" کتابیں لکھ کر انگریزوں کی تمام غلط فہمیاں دور کر دیں۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے اپنے نظریات پیش کرنے کے لئے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اس رسالے نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب مسلمان ذہنی طور پر جدید تعلیم کے لئے تیار ہو گئے تو سرسید نے اپنا

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL

تعلیمی منصوبہ تیار کیا اور مختلف علاقوں میں مدرسے اور اسکول قائم کرنا شروع کر دیے۔ تعلیمی منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے مندرجہ ذیل عملی اقدامات کئے گئے۔

۱۔ مراد آباد میں مدرسہ کا قیام: سر سید احمد خان نے 1859ء میں مراد آباد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس سے پہلے مراد آباد میں کوئی مدرسہ نہ تھا۔ اصل میں اس مدرسہ کو ... سے سرسید کو اندازہ ہو گیا کہ مسلمان تعلیمی میدان میں ان کا ساتھ ضرور دیں گے۔

۲۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام: 1862ء میں سرسید احمد خان نے غازی پور میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اس سوسائٹی نے جدید علوم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سوسائٹی نے تاریخ، کیمیا، طبیعیات، بیالوجی اور ریاضی کی انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کرائے اور ان ترجموں کو چھاپنے کے لئے چھاپہ خانہ کا اہتمام کیا۔ سوسائٹی کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کی ذہنی اور فکری آبیاری کرنا تھا۔

۳۔ غازی پور میں وکٹوریہ اسکول کا قیام: 1864ء میں سرسید احمد خان نے عوام کے چندے سے غازی پور میں ایک اسکول قائم کیا جس کا نام وکٹوریہ اسکول تھا اس اسکول میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ جس سے مفید نتائج برآمد ہوئے۔ اس اسکول کے قیام سے سرسید احمد خان نے مسلمان نوجوانوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگالیا کہ وہ انگریزی زبان سیکھنے میں کسی طرح بھی دوسری اقوام کے بچوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیز مسلمان اپنے بچوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔

۴۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجراء: 1866ء میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا اس رسالے کا سب سے بڑا مقصد انگریزوں کو ہندوستان میں رہنے والوں کے مسائل سے روشناس کرانا تھا۔ اس اخبار میں انگریزوں کی زیادتیوں اور معاشرتی استحصال پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس رسالے میں معاشرتی، اخلاقی، سائنسی مضامین بڑی پابندی سے شائع کیے جاتے تھے ان مضامین کی اشاعت نے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب برپا کردیا۔

مغربی اداروں کا معائنہ اور مشاہدہ: مذکورہ تعلیمی اقدامات انجام دینے کے بعد سرسید احمد خان 1869ء میں انگلستان چلے گئے وہاں انہوں نے انگریزوں کے نظام تعلیم کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ انگلستان میں انہوں نے بہت سے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نظام تعلیم کے طریقہ کار کا معائنہ کیا۔ اس دورے میں سرسید احمد خان اس بات سے بہت متاثر ہوئے کہ یہاں کے تعلیمی اداروں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اخلاق کا بہت اچھا انتظام ہے۔ چنانچہ انہوں نے واپس آکر اپنی مدد آپ کے اصول پر علی گڑھ کالج قائم کیا۔ اور اس کا نقشہ تیار کرایا۔

علی گڑھ کالج کا قیام: 1877ء میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج قائم کیا جو تاریخ میں ایم۔ اے۔ او کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اس کالج کو 1922ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا تھا اس کالج میں سرسید نے جدید تعلیم کا اعلیٰ انتظام کیا۔ اس کالج کے قیام پر کٹر مذہبی راہنماؤں اور رجعت پسند علماء نے سرسید کی سخت مخالفت کی اور ان کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات کے پہاڑ کھڑے کردیے۔ یہی نہیں بلکہ ان پر کفر کے فتوے بھی لگائے گئے۔

برطانوی حکومت بھی اس کالج کے قیام سے ناخوش تھی حکومت نے کالج کے قیام پر منظوری کے سلسلے میں عجیب و غریب شرائط لگائی کہ اگر کسی وقت کالج بند ہوجائے تو کالج کی زمین اور دوسرے تمام اثاثے حکومت کی ملکیت میں دے دیئے جائیں گے۔ سرسید نے اس شرط کو قبول کرلیا اور خدا کے بھروسے پر کالج قائم کردیا۔ یہ کالج تھوڑے ہی عرصے میں غیر معمولی ترقی کر گیا اور سرسید احمد خان کو یہ یقین ہوگیا کہ اب ان کا مشن پورا ہوجائے گا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام: سرسید احمد خان نے دور دراز کے علاقوں میں آباد مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے 27 دسمبر 1886ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط پلیٹ فارم فراہم کردیا اسی کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں 1906 میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔

تحریک علی گڑھ کی اہمیت (سیاسی پہلو): تحریک علی گڑھ مسلمانوں کی ایک عظیم تحریک تھی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی اور علمی پسماندگی کا علاج کر کے انہیں ہندوؤں کے مقابلے میں کھڑا کردیا اور ان میں ایسی انتظامی صلاحیتیں پیدا کردیں کہ وہ ہر میدان میں ہندوؤں کے دوش بدوش کام کرنے کے لائق بن گئے۔ تحریک علی گڑھ وہ تحریک تھی جس نے مسلمانوں میں قومیت کی ایک نئی روح پھونکی ان کے لئے سیاسی میدان ہموار کر کے انہیں جداگانہ حیثیت کا احساس دلایا اس تحریک نے مسلمانوں میں ایسا اتحاد پیدا کردیا تھا جس کی بناء پر مسلمانوں نے اپنی سیاسی حیثیت تسلیم کرانے کا پروگرام بنایا اور 1906ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم کی گئی اس تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کر کے ان کی منزل کی نشاندہی کردی۔

186...ء میں جب ہندوؤں نے اردو ہندی جھگڑا کھڑا کیا تو تحریک علی گڑھ کے بانیان نے ہندوؤں کی اس سازش کو روکنے کے لئے "اردو ڈیفنس سوسائٹی" قائم کی اور اس کی شاخیں تمام ہندوستان میں قائم کردیں۔ اس طرح سرسید احمد خان اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے اردو زبان کی ترقی کرتی رہی۔

تحریک علی گڑھ ایک ہمہ گیر تحریک تھی اس تحریک نے مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی میں گہرے نقوش چھوڑے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا۔ ان میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کیا۔ ان کی معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انہیں عمل اور جدوجہد کی ترغیب دی اور نئے دور کے تقاضے سمجھائے۔ اس طرح سرسید احمد خان کی یہ تحریک مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ بن گئی۔

تحریکِ علی گڑھ کے اثرات: تحریک علی گڑھ نے پورے جنوبی ایشیا میں اپنے اثرات چھوڑے۔ اس تحریک کی وجہ سے پنجاب، سندھ، سرحد اور بنگال میں تعلیمی میدانوں میں انقلاب آنے لگا۔ اور ان علاقوں میں کئی ایک ایسے لیڈر پیدا ہو گئے جنھوں نے سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر ہو کے ان علاقوں میں تعلیمی ادارے کھولے۔ بنگال میں سر سید کے کام کو نواب عبدالطیف نے جاری رکھا اور انہوں نے بنگال میں محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنا تھا۔ اس سوسائٹی نے بنگال کے مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں پوری طرح بیدار کیا۔

1884ء میں تحریک علی گڑھ سے متاثر ہو کر اہلِ پنجاب نے لاہور میں انجمن حمایت الاسلام قائم کی۔ انجمن حمایت الاسلام کے محرک منشی چراغ دین تھے اس انجمن کا مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت تھا۔ اس انجمن نے جدید علوم اور مذہبی تعلیم کے لئے بہت سے ادارے قائم کئے۔ یہ انجمن آج بھی تعلیمی مشاغل میں مصروف ہے۔

تحریک علی گڑھ سے متاثر ہو کر صوبہ سرحد کے آزاد منش مسلمانوں نے اپنے علاقے میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے ایک تعلیمی تحریک چلائی اس تحریک کے بانی صاحبزادہ عبدالقیوم تھے اس تحریک نے پشاور میں اسلامیہ ہائی اسکول اور اسلامیہ کالج قائم کئے ان دونوں اداروں نے سرحد میں جدید تعلیم کو عام کیا اور ایسے طلباء پیدا کئے جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

تحریک علی گڑھ نے سندھ کے مسلمانوں کو بہت متاثر کیا سید امیر علی جو لندن میں مسلمانانِ ہند کے لئے کام کر رہے تھے 1883ء میں کراچی آئے اور حسن علی آفندی پر زور دیا کہ وہ سندھ کے مسلمانوں کیلئے ایک معیاری درسگاہ قائم کریں چنانچہ 1885ء میں حسن علی آفندی نے کراچی میں سندھ مدرسہ قائم کیا جس میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا معیاری انتظام کیا گیا اس مدرسے نے ایسے قابل راہنما پیدا کئے جنہوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں تحریک علی گڑھ نے کئی اداروں کو جنم دیا جن میں جامعہ ملیہ، دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ قابل ذکر ہیں۔ یہ ادارے اگرچہ سرسید احمد خان اور تحریک کی مخالفت میں تھے مگر پھر بھی سرسید کی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

1898ء میں سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد ان کے ساتھیوں نے اس تحریک کو جاری رکھا اور سرسید احمد خان کے مشن کو پورا کیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام 1885ء

جنگِ آزادی 1857 کے بعد ہندوستانی عوام میں باغیانہ بے چینی پھیلنے لگی اور وہ انگریزوں سے نفرت کرنے لگے۔ انگریزوں نے جنگ آزادی کے بعد بعض ایسے اقدامات بھی کئے جن سے عوام کا خون کھولنے لگا۔ 1876ء سے 1880ء کے دور میں انگریزوں نے بلا جواز افغانستان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس سے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے جذبات خواہ مخواہ مشتعل ہوئے۔ اسی دوران انگریزوں نے اسلحہ ایکٹ منظور کر کے عام ہندوستانیوں کو اسلحہ رکھنے کے لئے لائسنس کا پابند کر دیا نیز اسلحہ بنانے اور اس کی تجارت کرنے کی بھی ممانعت کردی جبکہ سرکاری ملازمین اور انگریزوں پر یہ پابندی نہیں تھی۔ یہ امتیاز گویا ہندوستانیوں کو ناقابل اعتبار سمجھنے کا اعلان تھا۔ 1878ء میں جنوبی ہند کے وسیع علاقے پر قحط پڑ گیا جس سے پچاس لاکھ لوگ جان کی بازی ہار گئے۔ قحط دور کرنے کے لئے لارڈ لٹن نے کوئی خاطر خواہ بندوبست نہ کیا بلکہ وہ دہلی میں عیاشی کرتا رہا۔ عوام نے اس قحط سے میں ہلاک شدگان کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بعدازیں لارڈ لٹن نے اسی سال ورینکلر پریس ایکٹ جاری کر دیا جس کی رو سے غیر سرکاری اخبارات کو یہ ضمانت دینا پڑی کہ وہ حکومت کے خلاف مضامین لکھ کر عوام کو اس سے بدظن نہیں کریں گے۔

کانگریس کا قیام اور انگریزی مقاصد: انگریزوں کو اس بات کا احساس ضرور ہو گیا کہ ہندوستان کے عوام سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے زیرِ زمین سرگرمیوں اور سازشوں سے بچنے کی آسان صورت یہ تجویز کی کہ عوام کو نقاد اظہارِ خیال کا موقع فراہم کر دیا جائے۔ چنانچہ مسٹر ہیوم جو ایک برطانوی سول سروس کا اعلیٰ عہدیدار تھا نے یہ اندازہ پوری طرح لگا لیا کہ ہندوستان میں سیاسی اضطراب پھیل چکا ہے اور جگہ جگہ خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں ان سازشوں اور اضطراب کو روکنے کے لئے ہیوم نے ایک سیاسی کاقومی سطح کی تعلیم کا منصوبہ پیش کیا۔ چنانچہ لارڈ ڈفرن نے اپنی منظوری اور کچھ تجاویز کے ساتھ مسٹر ہیوم کو برطانیہ روانہ کیا تا کہ وہ اکابرین سلطنت سے صلاح مشورہ کرے لہٰذا برطانیہ میں اس نے لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز اور مسٹر سلیگ سے مل کر صلاح مشورہ کیا جس میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ جب وہ 28 دسمبر 1985ء کو واپس

ہندوستان آیا تو اس کے پاس ایک نئی سیاسی جماعت کی تشکیل کا اچھا خاصا ڈھانچہ موجود تھا۔ لہذا 28 دسمبر 1985ء کو اس نے ایک بنگالی عیسائی مسٹر بینر جی کی صدار... بمبئی میں ایک اجلاس منعقد کیا جس میں انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مندوبین کی... جو 27 تھی۔ جن میں صرف دو مسلمان تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد: مسٹر بینر جی نے کانگریس کے اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں انگریزوں کو یقین دلایا کہ وہ اور کانگریس ہمیشہ ان کی... رہیں گے اور پھر اس نے کانگریس کی طرف سے جن اغراض و مقاصد کا اعلان کیا وہ حسب ذیل تھے۔

۱۔ ہندوستانی نمائندوں کو حکومت میں نمائندگی دی جائے گی۔
۲۔ قومی وحدت کے لئے بھرپور سعی کی جائے گی۔
۳۔ انگریزوں سے وفاداری کی جائے گی۔
۴۔ انفرادی حکومت کا تحفظ کیا جائے گا۔
۵۔ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی باشندوں کو شریک کیا جائے گا۔
۶۔ مجلس قانون ساز بنائی جائے گی جس میں ہندوستانی نمائندوں کو شرکت کی اجازت ہوگی۔
۷۔ ملک میں ایک دستوری (آئینی) حکومت بنائے گی۔
۸۔ انگریزوں نے نہ صرف کانگریس کو جنم دیا بلکہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کانگریس اپنے اصلی اغراض و مقاصد سے ہٹ کر انقلابی ہندوؤں کے ہاتھوں میں انقلابی رنگ ا... کر رہی ہے۔ پھر بھی مدتوں وہ اس کی پرورش اور قیادت کرتے رہے۔ کانگریس کی بھی یہی صورت حال تھی۔ وہ اس قدر انگریز نواز تھی کہ برسوں "گلیڈسٹون" کی سالگرہ... رہی۔ کانگریس کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دادا بھائی نوروجی نے کہا "ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک انگریز کے وفادار ہیں" بس اس طرح کانگریس ہندوؤں... انگریزوں کے سیاسی مقاصد پورے کرتی رہے۔

تقسیم بنگال کے اسباب و نتائج

تقسیمِ بنگال: تقسیم بنگال بیسویں صدی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس صوبے کی آبادی بھی بہت زیادہ تھی۔ آبادی کے زیادہ ہونے کے علاوہ رقبہ بھی بہت تھا۔ اس کا ... چلانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس لئے انتظامی سہولت کے پیشِ نظر انگریزوں نے بنگال کو 1905 میں دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور دونوں حصوں کو دو صوبوں کا نام دیدیا گیا۔ ا... صوبہ مغربی بنگال اور دوسرا صوبہ مشرقی بنگال کے نام سے مشہور ہوا۔ تقسیم ہند کے وقت مشرقی بنگال پاکستان اور مغربی بنگال بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ کیونکہ مشرقی بنگال م... مسلمانوں کی آبادی بہت زیادہ تھی اور مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ مشرقی بنگال کا صدر مقام ڈھاکہ اور مغربی بنگال کا صدر مقام کلکتہ کو بنایا گیا۔

تقسیم کے اسباب:

۱۔ بنگال کی آبادی اور رقبہ بہت زیادہ تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا انتظام چلانا مشکل ہو گیا تھا۔
۲۔ ذرائع آمد و رفت کا فقدان تھا۔ اس لئے بنگال میں ہنگامی حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔
۳۔ بنگال میں ہندو مسلم فسادات انگریزوں کے لئے سوہان روح بن گئے تھے۔
۴۔ تمام تجارتی اور معاشی امور پر ہندوؤں کا قبضہ تھا، کارخانہ، تجارتی منڈیاں اور کاروباری کی ساری آسانیاں ہندوؤں کو میسر تھیں۔ اس لئے مسلمانوں کی معاشی اور معا... حالت بہت ہی خراب تھی۔
۵۔ بنگال میں معاشرتی برائیوں نے زور پکڑ لیا تھا۔ ڈاکہ زنی، چوری اور قتل جیسی برائیاں عام ہو چکی تھیں۔ امن و امن ختم ہو چکا تھا۔ گویا سمانی محفوظ نہ ہونے کے برابر تھا۔ ا... لئے تقسیم بنگال ضروری ہو گئی تھی۔
۶۔ مشرقی حصے کی تمام پیداوار پر مغربی حصے کے لوگوں کی اجارہ داری تھی۔
۷۔ ہندو زمینداروں نے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کیا ہوا تھا اور انہوں نے مسلمانوں کا معیار زندگی پست کر دیا تھا

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

تقسیم بنگال: تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفاد میں تھی اس لئے ہندو اس تقسیم سے بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے تقسیم بنگال کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں ہندوؤں نے باقاعدہ تحریک چلائی اس تحریک کی کامیابی کے لئے ہندوؤں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ بنگال کے انقلابی امور چلانے والوں کو تنگ کیا گیا۔ لارڈ کرزن پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے۔ غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انگریزوں پر بم پھینکے گئے۔ اس دن ہندوؤں نے سوگ کا دن منایا اور ہندے ماترم کو بطور قومی ترانہ اختیار کیا۔ ان باتوں سے تنگ آ کر لارڈ کرزن نے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک حکومت برطانیہ تقسیم منسوخ نہیں کرتی۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کا یہ سلسلہ 1911ء تک چلتا رہا۔

تقسیم بنگال پر مسلمانوں کا ردِعمل: تقسیم بنگال پر مسلمانوں نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ اطمینان کا سانس بھی لیا۔ تقسیم بنگال مسلمانوں کے مفادات میں تھی اس لئے انہوں نے تقسیم کے فیصلے کو قبول کر لیا اور اسے برقرار رکھنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ بلکہ اس سے معیار زندگی بلند کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ مسلمانوں نے بہت سی قراردادیں منظور کرا کر حکومت برطانیہ کو روانہ کیں اور تقسیم بنگال پر حکومت کا شکریہ ادا کیا۔

تقسیم بنگال کا نتیجہ قیام "مسلم لیگ": تقسیم بنگال نے 1905ء میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر دی۔ کیونکہ تقسیم بنگال کے نتیجے میں مشرقی بنگال میں "جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی" ہندوؤں کی بالادستی پر ضرب پڑی تھی۔ چنانچہ اس کے ردِعمل پر شدید ردِعمل کرتے ہوئے ہندوؤں نے اس تقسیم کی تنسیخ کے لئے تحریک شروع کر دی۔ پس یہیں سے مسلمانوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ اس موقع پر نواب سلیم اللہ نے کہا کہ "تقسیم بنگال" نے ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دیا ہے اور اب ہم بہتر طور پر اپنی جدوجہد کی سمت موڑ سکتے ہیں چنانچہ "اکتوبر 1906ء" میں "35" مسلمانوں کے ایک وفد نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ مستقبل میں مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں۔ پس اس طرح تقسیم بنگال کے ردِعمل میں ہندوؤں کے منفی رویے سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت بنانے کا عزم کیا اور "1906" میں مسلم لیگ معرض وجود میں آ گئی۔

شملہ وفد کی تشکیل، مطالبات اور اہمیت

شملہ وفد کی تشکیل: شملہ وفد کی تشکیل لکھنؤ میں سر عبد الرحیم کی صدارت میں مسلم قائدین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک کو اراکین کے چناؤ کا کلی اختیار دے دیا گیا انہوں نے اس وفد کے لئے 35 اراکین کا انتخاب کر لیا۔ یہی 35 رکنی وفد یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ کے مقام پر سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملا اور اپنے مطالبات کی دستاویز پیش کی۔

شملہ وفد کے مطالبات: شملہ وفد نے لارڈ منٹو کو جو دستاویز پیش کی اس میں مندرجہ ذیل مطالبات تھے

۱۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے انتخابی حلقے الگ الگ کر کے انہیں جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور یونیورسٹیوں کے سنڈیکیٹ میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

۳۔ مسلمانوں کو مجلس قانون ساز میں متناسب نمائندگی دی جائے۔

۴۔ مسلمانوں کو عدلیہ میں نمائندگی دی جائے۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے امداد دی جائے۔

شملہ وفد کی اہمیت: شملہ وفد کے مطالبات کے جواب میں لارڈ منٹو نے مسلمانوں کو پورا پورا یقین دلایا کہ ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کیا جائے گا اور دوسرے مطالبات پر ہمدردانہ غور کیا جائیگا۔ وائسرائے ہند کے اس وعدے کو برطانوی حکومت نے قانون مجریہ 1909 میں عملی شکل دے دی گئی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ اس طرح برطانیہ نے پہلی بار مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو عملاً تسلیم کیا اور اسی اصول نے پاکستان کی بنیاد رکھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام 1906ء

پس منظر: یکم اکتوبر 1906ء کو مسلمانوں نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو کے پاس اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے ایک وفد شملہ بھیجا۔ یہ 35 رکنی وفد سر آغا خان کی قیادت میں شملہ کے مقام پر لارڈ منٹو سے ملا اور اسے اپنے مطالبات کی دستاویز پیش کی۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا اس سے مسلمانوں میں جداگانہ وجود

اصرار بھی ہوا تو کیا کیا اگر اس امر کا بھی خیال تھا کہ وہ الگ سیاسی جماعت کے اپنے مفادات کی حفاظت کر سکتے۔ ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اس امر کو کیا گیا۔

مسلم لیگ کی تشکیل: ڈھاکہ کانفرنس کے بعد 30 دسمبر کو ایک اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا اور پورے غور و خوض کے بعد "آل انڈیا مسلم لیگ" سے ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ نواب وقار الملک کی صدارتی تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ نے باقاعدہ ایک قرارداد پیش کی۔ جس میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے قیام پر زور دیا گیا تھا۔ قرارداد منظور کر لی گئی اور مسلمانوں کی سیاسی جماعت وجود میں آ گئی۔ اس قرارداد کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر اور ظفر علی خان نے کی۔

مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد: ڈھاکہ کے اجلاس میں مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل تین مقاصد طے پائے۔

۱۔ مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے لئے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا اور حکومت کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا اور ضروریات کو حکومت کے سامنے پیش کرنا۔

۳۔ جہاں تک مسلمانوں کو نقصان نہ ہو دوسری قوموں سے اتحاد کرنا۔

مسلم لیگ کے اجلاس کی کاروائی مولانا محمد علی جوہر نے تحریر کی۔ اس کے جوائنٹ سیکریٹری نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک بنائے گئے اور اس کا صدر دفتر مراد آباد (ضلع امروہہ) میں قائم کیا گیا۔ مسلم لیگ کا پہلا باقاعدہ اجلاس 29، 30 دسمبر 1907ء کو کراچی میں منعقد ہو جس میں لیگ کے دستور کی منظوری دی گئی۔ بعد از مارچ 2008 میں اس کا ایک خصوصی اجلاس علی گڑھ میں ہوا۔ جس میں نئے عہدیداروں کے انتخاب کا عمل مکمل کیا گیا۔ اس اجلاس میں میجر حسین بلگرامی سیکریٹری اور ... خان صدر منتخب ہوئے اور اس کا صدر دفتر بھی مراد آباد سے بجائے علی گڑھ میں طے پایا۔ اس سال مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں بھی قائم کر دی گئی جس کی نگرانی سید امیر ... کے سپرد ہوئی۔

منٹو مورلی ریفارمز 1909ء

برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی جداگانہ حیثیت اور جداگانہ مقام کو تسلیم کرانے کے لئے بہت سے اقدامات کئے تاکہ ہندوستان کے مسلمان ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ اس سلسلے میں 1906ء میں مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم کی۔ اور یہی وہ جماعت تھی جس نے مسلمانوں کے حقوق کے حصول اور تحفظ کے لئے حکومت برطانیہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کئے اور جداگانہ نیابت کے حق کے لئے جان توڑ کوششیں کیں۔ جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرانے اور جداگانہ نیابت کا حق لینے کی کئی وجوہات تھیں۔ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے دونوں قومیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں دونوں کا ثقافتی ورثہ الگ تھا، دونوں کے مذہب اور ضابطہ حیات الگ تھا، دونوں میں کسی بھی لحاظ سے اشتراک ناممکن تھا۔ انگریز ان حالات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے وہ ان حالات کے پیش نظر ہندوستان میں جمہوری اقدار بحال کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔

قانونِ ہند 1909ء کی چند چیدہ چیدہ اصلاحات: قانون ہند 1909ء کا نفاذ نومبر 1909ء کو ہوا اس کے نفاذ سے مجموعی طور پر مسلمانوں کو اطمینان ہوا اس کی اہم اصلاحات یہ تھیں۔

۱۔ مرکزی مجلس قانون کی توسیع کی گئی اور مسلمانوں کو مرکزی کونسل میں پانچ نشستیں دے دی گئیں۔

۲۔ پنجاب، برما اور آسام کی مجالس قانون ساز میں 30 ارکان کا اضافہ ہوا۔

۳۔ بنگال، مدراس، یوپی، بمبئی، بہار اور اڑیسہ کی قانون ساز مجالس میں 50 ارکان کا اضافہ ہوا۔

۴۔ وائسرائے کونسل کے ارکان کی تعداد کو بڑھا کر ساٹھ کر دیا گیا۔

۵۔ جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر لیا۔

۶۔ قانون ساز اسمبلی کو بجٹ پر مکمل بحث کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

۷۔ کونسلوں کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا اور ان کے دائرہ بحث کو وسیع کر دیا گیا۔

Lecturer SHAIKH ASIF ZAHOORI

۸۔ مرکزی اور صوبائی کونسلوں اور بعض دوسرے اداروں کو اپنا انتخاب کی اجازت دے دی گئی۔
۹۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب کی اجازت دے دی گئی۔
۱۰۔ وائسرائے کی کونسل میں ایک ہندوستانی کو شامل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔
۱۱۔ انڈیا کونسل لندن میں دو ہندوستانیوں کو شامل کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

قانون ہند 1909 کی اہمیت: یہ قانون "منٹو مارلے اصلاحات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس قانون کی رو سے مسلمانوں کے مطالبے کو کسی حد تک مان لیا گیا تھا اور جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ عوام کو پہلی بار قانون سازی میں اپنے خیالات و نظریات کے اظہار کا بہترین موقع فراہم کیا گیا اور بڑی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں قوموں کی انگریزوں کے خلاف نفرت میں کمی آ گئی۔ ان اصلاحات سے پہلے وائسرائے کی انتظامی کونسل میں تمام تر انگریز ارکان ہوتے تھے اور کونسل کی تمام کارروائی ان کے اپنے جذبات اور خیالات کی عکاس ہوتی تھی اب اس میں ایک ہندوستانی رکن بھی شامل کر لیا گیا تاکہ وہ ہندوستان کے مسائل کے بارے میں ان کو آگاہ کرتا رہے۔ اس طرح ان اصلاحات سے ہندوستان کے باشندوں کو اپنے جذبات حکومت تک پہنچانے کا پورا موقع مل گیا۔ ان اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دے کر ان کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا کیونکہ (کانگریس) کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ بہر حال ان اصلاحات کو حکومت خود اختیاری کی طرف ایک اہم قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

میثاق لکھنؤ

شملہ وفد کو کامیابی نصیب ہوئی اور جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا لیکن ہندوؤں نے اس اصول کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ مسلمانوں کی یہ کوشش تھی کہ کانگریس جو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اس اصول کو تسلیم کرلے۔ 1916ء مسلم لیگ کے رہنماؤں نے قائداعظم کے مشورے سے کانگریس اور مسلم لیگ کا ایک متحدہ اجلاس لکھنؤ میں بلایا۔ کانگریس متحدہ اجلاس کے لئے تیار ہو گئی چنانچہ لکھنؤ اجلاس ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ایک سمجھوتہ ہوا جو "لکھنؤ پیکٹ" کے نام سے مشہور ہو گیا اسی پیکٹ کو "میثاق لکھنؤ" کہتے ہیں۔ اس کے مطابق کانگریس نے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا۔ میثاق لکھنؤ کے اجلاس کی صدارت سریندر ناتھ بینر جی نے کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح اور راجہ محمود آباد نے سربراہی کے فرائض انجام دیے۔

میثاق لکھنؤ کے اہم نکات: میثاق لکھنؤ میں کئی ایک اہم نکات طے کیے گئے ان نکات کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ مرکزی قانون ساز ادارے میں ڈیڑھ سو ارکان ہونگے ان میں ایک تہائی مسلمانوں کی تعداد ہو گی۔
۲۔ مسلمان نمائندہ کا انتخاب جداگانہ بنیاد پر ہوگا۔
۳۔ صوبائی قانون ساز اداروں کے لئے براہ راست انتخاب کا طریقہ اپنایا جائے گا۔
۴۔ مسلمانوں کے تناسب کی نئی صورت حال کا تعین کر دیا جائے گا۔
۵۔ کوئی مسودہ قانون تین چوتھائی اراکین کی تائید کے بغیر منظور نہیں کیا جائے گا۔
۶۔ ہر قانون ساز ادارہ اپنا صدر خود چنے گا اور ان اداروں کی میعاد پانچ سال ہو گی۔
۷۔ گورنر جنرل کی ویٹو پاور کو محدود کر دیا جائیگا۔
۸۔ کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ عہدوں پر بھی ہندوستانیوں کا تقرر کیا جائے گا۔
۹۔ گورنر اپنی انتظامیہ میں نصف اراکین ہندوستانی مقرر کرے گا۔
۱۰۔ انتظامیہ اور عدلیہ الگ ہوں گی اور صوبائی عدالتیں، صوبائی کورٹ کے ماتحت ہوں گی۔

میثاق لکھنؤ کی اہمیت: یہ معاہدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مصالحت اور آئینی دستوری تاریخ مین سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ اور منصفانہ سمجھوتہ تھا جس سے ہندو اور مسلمان دونوں مطمئن ہو گئے تھے۔ حکومت برطانیہ کا ایک مشترکہ تجویز بڑی تفصیل سے پیش کی گئی جس کو ہندوستان کے کروڑوں عوام کی بھرپور حمایت حاصل تھی یہ شاندار کارنامہ محمد علی جناح کی شدید محنت اور دن رات کی کوشش سے پورا ہوا۔ اسی معاہدہ کی بناء پر قائد اعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر کہا جانے لگا۔

میثاق لکھنؤ میں نہ صرف جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کیا گیا بلکہ یہ بھی طے پایا کہ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی کا حق دیا جائے گا نیز کسی بھی قوم کی تین چوتھائی ... سے کوئی قانون منظور نہیں ہوگا۔ اس معاہدے کے رو سے مسلمانوں کے قومی تشخص کو تسلیم کر لیا گیا۔ یہ معاہدہ پورے برصغیر میں ہندو مسلم اتحاد کو خوشگوار فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوا یہ اور بات ہے کہ بعد میں یہ معاہدہ ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کی نذر ہو گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء

لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے تو انہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کی کاروائیوں کے نتیجے کے طور پر ملک کے آئینی مسائل اور آئندہ ... اصلاحات پر ہندوستان کے مختلف طبقوں سے تبادلہ خیالات کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب ہندوستانیوں کو کچھ نہ کچھ دیئے بغیر چارۂ کار نہیں۔ چنانچہ ... وزیر ہند "ایڈون مانٹیگو" کوئی اصطلاحات رائج کرنے کے لئے لکھا۔ اس کے جواب میں 20 اگست 1917ء کو مانٹیگو نے اصلاحات کے لئے اور ساتھ ہی دورۂ ہند ... پروگرام کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو ملکی نظم و نسق کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کا موقع دیا جائے گا اور تدریجاً خود مختار اداروں ... مقصد کے لئے ترقی دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ہندوستان عظیم برطانیہ کے جزو کا انفنگ کی حیثیت سے ترقی کی راہیں طے کریگا اور ایک ذمہ دار حکومت بن جائے گا۔

بنیادی نکات: مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مرکزی قانون ساز مجلس (اسمبلی) کو دو ایوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ایک مرکزی مجلس قانون ساز اور دوسری ریاستی کونسل۔ اور ان دونوں ایوانوں میں اکثریت منتخب ارکان کی رکھی گئی۔

۲۔ مرکزی مجلس قانون میں 150 ارکان تھے جن میں 103 منتخب اور 47 نامزد ارکان تھے۔

۳۔ ریاستی کونسل میں 60 ارکان تھے جن میں سے 33 منتخب اور 27 نامزد ارکان تھے جنہیں نامزد کرنے کا اختیار وائسرائے کو تھا۔

۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز کی مدت تین سال مقرر کی گئی۔

۵۔ ریاستی کونسل (Council of State) کی میعاد پانچ سال مقرر کی گئی لیکن وائسرائے کو اس معیاد میں توسیع کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

۶۔ اسمبلی کے پہلے اسپیکر (Speaker) کو نامزد کیا گیا لیکن بعد میں ارکان اسمبلی میں سے اس کا انتخاب ہونا قرار پایا۔

۷۔ صوبائی اسمبلی میں توسیع کر دی گئی اور ارکان کی تعداد 100 مقرر کی گئی جن میں سے 70 ارکان منتخب اور 30 نامزد ہونگے۔

۸۔ صوبائی اسمبلی کی میعاد تین سال مقرر کی گئی لیکن اس میں توسیع کا اختیار بھی گورنر کو دے دیا گیا۔

۹۔ صوبائی وزیروں کو چند ایک معاملات طے کرنے کا اختیار دے دیا گیا مگر اہم امور گورنر اور اس کی ایگزیکٹو کونسل (Executive Council) کے تحت رکھے گئے۔

۱۰۔ صوبائی ایگزیکٹو کونسل کے سرکاری ارکان کو مجلس قانون ساز کی بجائے وزیر ہند کو جوابدہ بنا دیا گیا۔

۱۱۔ مرکزی مقننہ کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ برٹش انڈیا کے متعلق کسی قسم کا کوئی قانون بنا سکتی ہے۔

۱۲۔ مرکزی مجلس قانون ساز کو رائج الوقت قوانین منسوخ کرنے یا ان میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا

۱۳۔ اس ایکٹ کے تحت مرکزی اور صوبائی امور کی واضح حد بندی کر دی گئی۔

۱۴۔ اسمبلی کے ارکان کو آزادی تقریر کی اجازت دے دی گئی اور انہیں حکومت پر سوالات کرنے کی اجازت بھی مل گئی البتہ بجٹ پر بحث کرنے کا حق رد دیا گیا۔

۱۵۔ فوج، مواصلات، تجارت، محاصل، کرنسی اور نظم و نسق کے محکمے مرکز کے سپرد کر دیئے گئے۔ تعلیم، زراعت، صحت اور پولیس کے مقامی محکمے صوبائی حکومت کو دے دیئے گئے جبکہ مالگذاری، جنگلات، عدالت، جیل خانے اور مزدوروں کے مسائل گورنروں کے خصوصی اختیارات میں شامل کر دیئے گئے۔

ردِعمل: اصل میں یہ نظام اور اصلاحات کافی مشکل اور ناقابلِ فہم تھیں۔ عملی طور پر ان کے نفاذ مشکل تھا۔ پھر صوبوں میں وزراء اور گورنر اس کی مجلس عاملہ کے درمیان اختیار کے اس نظام کو دو عملی نظام کہا گیا۔ اس ایکٹ کی ساری دفعات سیاسی جماعتوں کی توقعات اور ان کے مطالبات سے بہت ہی کم تھیں چنانچہ کانگریس نے انہیں بالکل مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ نے اس اصلاحات کو رد تو نہ کیا مگر ان کے تحت منعقد ہونے والے انتخابات میں حصہ نہ لیا۔ اس ایکٹ کی رو سے نافذ ہونے والی اصلاحات سے اگرچہ ہندوستانیوں کو حکومت میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی تھی مگر حکم کا عصا انگریز کے ہاتھ میں رہا اور مرکزی قانون ساز اسمبلی ہونے کے باوجود ان کی مقننہ وائسرائے ...

خوشنودی اور قبولیت کی محتاج تھی۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کے مقابلہ میں باقائی ریاستوں جیسے چھوٹے چھوٹے علاقوں کو تو حق خود اختیاری دے دیا تھا لیکن ان کے نزدیک ہندوستان کے 40 کروڑ عوام کو بھیڑ بکریوں کے گلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں سخت بے چینی پھیل گئی اور ایک مرتبہ پھر انقلابات برپا کرنے کے لئے اسلحہ اکٹھا کیا جانے لگا۔

رولٹ ایکٹ

فروری 1919ء میں حکومتِ ہند نے دفاعی قوانین کے تحت مرکزی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا جسے "رولٹ ایکٹ" کہتے ہیں یہ ایکٹ دو مسودات قانون پر مشتمل تھا جس کمیٹی نے یہ ایکٹ پیش کیا تھا اس کے صدر مسٹر سڈنی رولٹ تھے اس لئے اس رولٹ ایکٹ کہا جاتا ہے۔

رولٹ ایکٹ کے نکات: اس ایکٹ کے تحت جو بل مرکزی اسمبلی میں پیش کیا گیا اس کی دفعات اور نکات یہ تھے:

۱۔ کسی بھی ہندوستانی کو وجہ بتائے بغیر گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ اس قانون کے تحت سزا پانے والے شخص کو اپیل کا حق نہیں دیا گیا تھا۔

۳۔ گرفتار ہونے والے شخص کو شہادت کے بغیر ہی سزا دی جاسکتی ہے۔

۴۔ اس قانون کے تحت اخبارات کی آزادی سلب کر دی گئی۔

۵۔ اس قانون کے تحت عدالتی اختیارات عاملہ کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف ردِعمل: یہ ایکٹ بہت ہی جابرانہ کا حامل تھا۔ اس ایکٹ کی رو سے ہندوستان بھر کے اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی اور حکام کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ کسی بھی الزام میں وجہ بتائے بغیر جسے چاہیں گرفتار کر لیں۔ اس ایکٹ کے خلاف پورے ملک میں احتجاج کیا گیا گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ وہ اس ایکٹ میں موجود قوانین کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے۔

قائداعظم نے اس ایکٹ کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار اس طرح کیا کہ "مجرمانہ سیاسی سازش کا مسئلہ رولٹ کمیٹی نے اس طرح پیدا کیا ہے گویا ہندوستان میں تمام جرائم پیشہ لوگ آباد ہیں۔ اس بل میں ہندوستانی اراکین کی رائے اور عوام کے جذبات کا بالکل احترام نہیں کیا گیا۔ اس کمیٹی کی سفارشات ایسی نہیں ہیں جنہیں کوئی شائستہ حکومت تسلیم کر لے۔ ایسی سفارشات کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔"

ان سیاہ قوانین کے خلاف سخت ردِعمل ہوا۔ پورے ہندوستان میں جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے۔ جلوس پر گولی چلی اور سارے ہندوستان میں ہڑتالیں ہوئیں۔ اس طرح سارے ملک میں افراتفری اور بدنظمی پھیل گئی۔ قائداعظم نے مجلس قانون ساز کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور گاندھی جی نے قیصر ہند کا اعزاز واپس کر دیا۔ اسی ایکٹ کی وجہ سے 10 اپریل 1919ء کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا۔

تحریک خلافت کے مقاصد اور برصغیر کی سیاست میں اس کا کردار

تحریک خلافت کا پس منظر: 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا جب ترکی نے اٹلی کے مقابلے کے لئے مصر کے راستے سے اپنی فوج کو بھیجنا چاہا تو انگریزوں نے مصر کے راستے سے ترک فوج کو گذرنے کی اجازت نہ دی۔ اس طرح اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد 1912ء میں ترکی کی ماتحت بلقان ریاستوں نے متحد ہو کر ترکی کے خلاف بغاوت کر دی۔ بلقان کی باغی ریاستوں کی حمایت میں انگریز بھی سرگرم عمل ہو گئے کیونکہ انگریز مسلمانوں کی مرکزی سلطنت "ترکی" کو ہر صورت میں ختم کرنا چاہتے تھے حالانکہ ہو ترکی کے سب سے بڑے ہمدرد ہونے کے دعویدار تھے۔ روس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بلقان کی ریاستوں پر حملہ کر دیا۔ اس طرح بلقان کا علاقہ بھی ترکی کے قبضہ سے نکل گیا اور انگریز ترکی کی خلاف جنگ میں شامل ہوا۔ ترکی کی مسلمہ مرکزی سیاسی ومذہبی حقیقت کے باعث مسلمانان ہند نے ترکی کی خلافت کی بقا کے لئے تحریک خلافت کی حمایت کی۔

مجلسِ خلافت کا قیام: تحریکِ خلافت کو چلانے کے لئے سب سے پہلے ایک مجلسِ خلافت کی بنیاد رکھی گئی۔ مجلسِ خلافت کا مقصد یورپی ممالک کی ریشہ دوانیوں کو روک کر مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنا اور ترقی کی خلافت کو بحال کرانا تھا۔ مجلس خلافت میں مولانا عبدالباری فرنگی محل، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا حسرت

موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، حکیم اجمل خان، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر انصاری اور سیٹھ محمد چھوٹانی شامل تھے
ان تمام حضرات نے تحریکِ خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں جگہ پائی۔

تحریکِ خلافت کے اثرات: تحریکِ خلافت میں مسلمانوں نے بے پناہ تکالیف برداشت کیں اور خلافتِ ترکی کو بچانے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیں مگر تحریکِ خلافت کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس کے باوجود اس تحریک نے برصغیر کی سیاست میں دور رس اثرات چھوڑے۔

۱۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں جذبہ جہاد ابھارا۔

۲۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔

۳۔ اس تحریک نے عوام اور رہنماؤں میں گہرا تعلق پیدا کر دیا۔

۴۔ اس تحریک نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔

۵۔ اس تحریک نے پاکستان کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا۔

برصغیر کی سیاست میں تحریکِ خلافت کا کردار: ہندوستان میں اگرچہ تحریک اپنے معینہ مقاصد پوری طرح حاصل نہ کر سکی لیکن پھر بھی اس نے برصغیر کی سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس تحریک سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ ڈگمگا کر رہ گئی۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے ان کو آزادی کے راستے پر لگا دیا۔ یہ تحریک وہ تحریک تھی جو مسلمانوں کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس تحریک نے برصغیر میں بڑے بڑے مسلم لیڈر پیدا کر کے انہیں قوم کی قیادت کے لئے تیار کر دیا اور جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر پہنچی تو اسی تحریک کے پیدا کردہ لیڈر قائدِ اعظم کے ساتھ مل کر قیامِ پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے لگے اور بالآخر تحریک خلافت کے ہموار کردہ راستہ پر چل کر مسلمان علیحدہ مملکت کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

سائمن کمیشن

سائمن کمیشن 8 نومبر 1927 کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون نے سرجان سائمن کی قیادت میں مقرر کیا۔ یہ کمیشن چھ ارکان پر مشتمل تھا اس کے تمام ارکان انگریز تھے اور اس کمیشن کے وفد میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کا کام ہندوستان کے سیاسی حالات اور دستور کا جائزہ لے کر حکومت برطانیہ کے سامنے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کرنا تھا چنانچہ 3 فروری 1928ء کو یہ کمیشن بڑے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ ہندوستان پہنچا۔ اس کمیشن کی آمد پر پورے ہندوستان میں مظاہر اور فسادات ہوئے مگر مخالفت کے باوجود اس نے اپنی رپورٹ حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دی۔

تجاویز:

۱۔ ہندوستان کے لئے وفاقی نظام رائج کیا جائے۔ مرکز کے اختیارات ضرورت کے مطابق صوبوں کو منتقل کر دیئے جائیں۔

۲۔ صوبوں میں ایسی حکومتیں قائم کی جائیں جو اپنے اختیارات کے استعمال کے معاملات میں مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوں۔

۳۔ صوبوں کی حکومتیں برطانیہ کے نظام کے مطابق نہ ہوں۔

۴۔ صوبہ سرحد کے لئے ایک قانون ساز مجلس قائم کی جائے۔

۵۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنانے پر توجہ دی جائے۔

۶۔ حق رائے دہی کا دائرہ وسیع کر دیا جائے۔

۷۔ مرکزی حکومت کو نہایت مستحکم اور مضبوط بنایا جائے۔

سائمن کمیشن کے خلاف ردِعمل: جب سائمن کمیشن ہندوستان پہنچا تو کانگریس اور مسلم لیگ نے اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔ کمیشن سے تعاون نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے وفد میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے سائمن کمیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہ کر کے حکومتِ برطانیہ نے سخت غلطی کی ہے۔ اس موقع پر مسلم لیگ اور کانگریس نے بمبئی میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "سائمن کمیشن واپس جاؤ" قائد کا یہ نعرہ پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

نہرو رپورٹ 1928 اور اسکے نتائج

سائمن کمیشن سے بائیکاٹ میں کانگریس اور مسلم لیگ تقریباً ہم خیال تھی اس کمیشن کی سفارشات ابھی پالیمنٹ میں پیش بھی نہ ہوئی تھیں کہ ہندوستان میں اس کی تشکیل، اس کی کارروائیوں اور اس کی حیثیت کے بارے میں ہیجان برپا ہوگیا اس پر برطانوی وزیر امور ہند مسٹر برکن ہینڈ نے برہم ہونا شروع کر دیا اور اس نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ہندوستانی اس درجہ منقسم، مختلف الخیال اور ایک دوسرے سے بیزار ہیں کہ وہ ایک متحدہ دستورِ اساسی بھی نہیں بنا سکتے"۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج تھا انڈین نیشنل کانگریس نے اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے 12 فروری 1928 کو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں بلائی۔ اس کانفرنس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری اقوام کے نمائندے شریک ہوئے اور یہ طے ہوا کہ ایک دستورِ اساسی بنایا جائے اور ہندوستان کے مطالبات کی صورت میں حکومت کے سامنے پیش کیا جائے اس کانفرنس نے باقاعدہ دستور سازی کے لئے کمیٹی تشکیل دی جسے ہندوستان کے دستورِ اساسی کا کام سونپا گیا اس کمیٹی کے سربراہ پنڈت لال نہرو مقرر ہوئے اس کمیٹی میں دو مسلمان ارکان سر علی امام اور جناب شعیب قریشی بھی شامل تھے لیکن اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس لئے اس کانفرنس میں کوئی خاص فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر کار اس کمیٹی کا اجلاس 19 مئی 1928ء کو بمبئی میں دوبارہ ہوا اس اجلاس میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری نے شرکت کی اس اجلاس میں مسلمانوں کی کھل کر مخالفت کی گئی اس سے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ بہر حال مقررہ کردہ کمیٹی نے جو سفارشات مرتب کیں انہیں ہندوستان کی سیاسی تحریک میں "نہرو رپورٹ" کہتے ہیں۔ پس اس طرح نہرو رپورٹ سائمن کمیشن کے ایجنڈے میں 19 مئی 1928 کو شائع کی گئی۔

نہرو رپورٹ کے اہم نکات: نہرو رپورٹ میں جو سفارشات پیش کی گئی ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ برصغیر ہندوستان کو خود مختارانہ حیثیت کی ایک ذمہ دار حکومت عطا کی جائے۔

۲۔ اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری زبان بنایا جائے۔

۳۔ جداگانہ انتخابات کے اصول کو منسوخ کر کے مخلوط انتخابات کا طریقہ رائج کیا جائے۔

۴۔ ہندوستان میں وفاقی نظام کے بجائے وحدانی نظام رائج کیا جائے۔

۵۔ مرکزی مجلس قانون میں مسلمانوں کو 1/4 حصہ نشستیں دی جائیں۔

۶۔ امورِ دفاع و خارجہ انگریز کے سپرد ہی رہنے دیئے جائیں۔

۷۔ جنوبی ہندوستان میں ایک نئے ہندو صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۸۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم نہ کیا جائے۔

۹۔ بلوچستان کو مکمل صوبہ بنایا جائے۔

۱۰۔ مرکزی حکومت وزیر اعظم کے علاوہ چھ وزیروں پر مشتمل ہو جن کے تقرر گورنمنٹ خود کرے۔

نہرو رپورٹ کے نتائج: نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے حقوق کو یکسر پامال کر دیا اور مسلمانوں کو سیاسی تحفظ دیئے بغیر جداگانہ طریقہ انتخاب ختم کر کے مضبوط مرکز پر مبنی دستور کی سفارش کی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں میں اپنی تہذیب، ثقافت اور اسلام سے جو عقیدت پائی جاتی ہے وہ ختم ہو جائے اور ان میں ہندوستانی قومیت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اصل میں اس رپورٹ کو آڑ میں ہندو مسلمانوں پر اپنی راج دھانی قائم کرنے کا راستہ ہموار کر رہے تھے۔

قائدِ اعظم کے چودہ نکات اور ان کی اہمیت

ہندوؤں نے 1928ء میں ایک رپورٹ پیش کی جو نہرو رپورٹ مسلمانوں کے لئے ایک کھلا چیلنج تھی اس رپورٹ کی تمام شرائط ہندوؤں کے مفادات سے وابستہ تھیں اور اس میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے تمام مطالبات اور تجاویز رد کر دی گئی تھیں۔ چنانچہ قائدِ اعظم نے نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے چودہ نکات پیش کئے انہیں نکات نے مسلمانوں کی آئینی جدوجہد کی راہیں متعین کیں۔

قائدِ اعظم کے چودہ نکات:

Lecturer SHAIKH ZAHOOR IQBAL

۱۔ قائدِ اعظم نے چودہ نکات 1929ء میں پیش کئے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ملک کا آئین وفاقی ہو۔

۲۔ تمام صوبوں کو یکساں حکومت خود مختاری دی جائے۔

۳۔ اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

۴۔ طریقہ انتخاب جداگانہ ہو۔

۵۔ مرکزی مجلس میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہو۔

۶۔ سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے۔

۷۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے۔

۸۔ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور زبان وادب کو آئینی تحفظ دیا جائے۔

۹۔ مرکز اور صوبوں میں کوئی ایسی وزارت قائم نہ کی جائے جس میں مسلم وزراء کی تعداد ایک تہائی نہ ہو۔

۱۰۔ کوئی ایسا مسودہ قانون منظور نہ کیا جائے جس کی مخالفت کسی فرقہ کے نمائندوں کی 3-4 تعداد کرے۔

۱۱۔ شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۲۔ تمام فرقوں کو مذہبی اجتماع کی آزادی، رسم ورواج اور عبادت کی آزادی ہوگی۔

۱۳۔ صوبوں کی ایسی منصوبہ بندی نہ کی جائے جس سے مسلم اکثریت متاثر ہو۔

۱۴۔ دستور میں ترمیم کے لئے وفاق کی تمام اکائیوں کی منظوری ضروری ہوگی۔

برصغیر ہندوستان پر چودہ نکات کے اثرات: برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں قائدِ اعظم کے چودہ نکات کے بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان نکات نے مسلمانوں کی آئ... جدوجہد کی راہیں متعین کردیں۔ کیونکہ یہ نکات مسلمانوں کے جذبات کی مکمل عکاسی کرتے تھے اور انگریزوں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا کہ جہاں تک مطالبات کا تعلق ہے ہندوؤں کے مطالبات کے مقابلے میں زیادہ مناسب اور بہتر ہیں اور ان مطالبات کی ضمانت کا تصور خود حکومت برطانیہ نے بھی دیا تھا۔

قائدِ اعظم کے یہ چودہ نکات تاریخ میں کافی اہمیت کے حامل ہیں اس لئے کہ ان میں جناح کی پالیسی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ان کے مطالبات کا راز مضمر ہے۔ لندن میں تینوں گول میز کانفرنسوں میں محمد علی جناح اور دوسرے مسلم قائدین نے وہی مؤقف اختیار کیا جو چودہ نکات میں شامل کیا گیا تھا۔ اس طرح چودہ نکات نے ا... معاملات کو سلجھانے کے لئے راستہ ہموار کردیا۔ مسلم لیگ چودہ نکات کی روشنی میں قیام پاکستان کی کوشش کرتی رہی۔

علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد اور اسکی تاریخ اہمیت 1930ء

علامہ اقبال ایک عظیم مفکر اور مدبر تھے ان میں فہم وفراست کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ مسلمان قوم کے مسیحا تھے وہ ایک آزاد منش فکری تھے اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑ... رہنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے پاک وہند کے مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکنے اور خفتہ قوم کو جگانے کا تہیہ کیا اس سلسلے میں انہوں نے اپنی شاعری تحریروں اور تقریروں کو سہارا بنایا۔

خطبہ الٰہ آباد کے مندرجات: الٰہ آباد میں مسلم لیگ کا جلسہ 29 اور 30 دسمبر 1930ء کو ہوا جس میں علامہ اقبال نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ایک مملکت دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ میں دیکھ رہا ہوں کہ شمالی مغربی اسلامی ریاست کم سے کم شمالی مغربی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ ا... خطبے کے مندرجات یہ تھے۔

۱۔ اس خطبہ میں علامہ اقبال نے حالات واقعات کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا اور پھر مسلمانوں کے افکار وخیالات کا اظہار کرنے کے بعد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ذکر کیا۔

۲۔ علامہ نے فرمایا کہ "ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد ذاتوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں ہے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت ترک کرکے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کرلیں یہی وجہ ہے کہ باہمی اشتراک کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اس لئے مسلمانوں کو اپنی ترقی اور بقا کے لئے آزادی کی راہ متعین کرنا چاہئے۔"

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

۳۔ علامہ صاحب نے فرمایا کہ "ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقے میں مرکوز کر دیا جائے اگر یوں ایک مرکزیت قائم کردی جائے تو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیاء کی گتھیاں سلجھ جائیں گے۔"

۴۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ میں مسلمانانِ ہندوستان کو کبھی یہ رائے نہیں دونگا کہ وہ ایسے نظامِ حکومت سے اتفاق کرلیں جو حقیقی فیڈریشن کے اصول پر مبنی ہو یا جس میں ان کے سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

۵۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ دو آئینی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ ورانہ مسائل کے مستقل تصفیئے کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم از سرِ نو کی جائے لیکن اگر مسلمانوں کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا جائے تو پھر ہندوستان کے مسلمان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوں گے جس کے تحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کرلیں یا مرکزی مجلس میں انہیں 33 فیصد نشستیں نہ مل جائیں۔

٦۔ ایک مسلم ریاست کے قیام کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے فرمایا کہ ہندو اور مسلم دو الگ قومیں ہیں ان کی ثقافت الگ ہے ان کا مذہب الگ ہے اس لئے ان کے تمدن اور معاشرت میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکتی لہذا برصغیر کے مسائل کا حل یہی ہے کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی جداگانہ اور خودمختار ریاست قائم ہو۔ لہذا میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ملا دیا جائے۔

خطبہ الہٰ آباد کو برصغیر کے سیاسی افق کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے اس خطبہ سے مسلمانوں کی علحیدہ قومیت کا نظریہ پوری طرح واضح ہوگیا اور اسلام کے سیاسی تصورات مسلمانوں کے سامنے واضح صورت میں عیاں ہوگئے اور اس طرح یہ خطبہ مسلمانوں کے لئے روشنی کا ایک مینار ثابت ہوا جس نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور ایسی منزل کی نشاندہی کی جس کے بغیر ان کے مسائل کا حل ممکن نہ تھا۔

گول میز کانفرنسیں 32-1930ء

1930 سے 1932ء کے درمیانی عرصے میں لندن میں برطانوی حکومت نے آئینی اصلاحات کی نئی قسط کا فیصلہ کرنے کے لئے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جسے گول میز کانفرنسوں کا نام دیا گیا۔

انعقاد کا مقصد: گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کے مقاصد درج ذیل ہیں:

ا۔ برصغیر کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنا۔

۲۔ ہندوستانیوں کے لئے آئینی حکومت بنانے پر غور زکرنا۔

۳۔ فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کرنا۔

۴۔ برصغیر ہندوستان میں امن وامان بحال کرنے کے لئے کوئی نیا فارمولا تیار کرنا۔

پہلی گول میز کانفرنس: یہ کانفرنس 12 نومبر 1930ء کو لندن میں شروع ہوئی اور 19 جنوری 1931ء تک جاری رہی اس کانفرنسمیں ہندوستان کے وائسرائے نے 57 مندوبین کو شرکت کی دعوت دی تھی جن میں ہندو اور مسلمان شامل تھے مگر کانگریس نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ جن ہندو رہنماؤں نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔

ا۔ ڈاکٹر مونجے ۲۔ مسٹر جیکر ۳۔ سرتیج

مسلم لیگ نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے ایک وفد تشکیل دیا اس وفد میں مندرجہ ذیل قائدین شامل تھے۔

ا۔ سر آغا خان ۲۔ مولانا محمد علی جوہر ۳۔ محمد علی جناح

۴۔ مولوی فضل الحق ۵۔ سر شاہ نواز ٦۔ نواب سر احمد سعید چھتاری

۷۔ سر محمد شفیع ۸۔ علام حسین ہدایت اللہ ۹۔ چوہدری ظفر اللہ

۱۰۔ راجہ شیر محمد ۱۱۔ بیگم شاہ نواز

مسلم لیگ کے وفد کی قیادت سر آغا خان کر رہے تھے لیکن اس وفد میں سب سے سرگرم رکن مولانا محمد علی جوہر تھے انھوں نے اس کانفرنس میں اپنا موقف بیان کرتے ہوئے

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

فرمایا میں ایک غلام ملک میں زندہ رہنے سے آزاد ملک میں مرنا بہتر سمجھتا ہوں میں یہاں سے ہندوستان کے لئے آزادی لے کر جاؤں یا اسی ملک میں اپنی قبر کے لئے جگ
لوں گا۔ اس کانفرنس میں اصل اہم کردار اتفاق کو گیا تھا مگر کانگریس کی طرف سے مسٹر جیکر نے مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کر کے کانفرنس کا سارا ماحول خراب کر دیا اور
کانفرنس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

دوسری گول میز کانفرنس: یہ کانفرنس سات ستمبر 1931ء کو شروع ہوئی اور یکم دسمبر 1931ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ کے سابقہ وفد نے شرکت کی البتہ اس
وفد میں علامہ اقبال کو بھی شامل کر لیا گیا۔ کانگریس کی طرف سے مہاتما گاندھی نے شرکت کی۔ گاندھی کی شرکت کا مقصد کانفرنس کو ناکام بنانا تھا کہ اس طرح برطانوی حکومت
کانگریس کے اثر کا پتہ چل جائے گا لہٰذا اس نے کانفرنس میں نہایت ہی قابل اعتراض رویہ اختیار کیا اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت کانگریس ہے اور باقی
تمام جماعتیں کوئی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے میں کسی جرگے کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں، مسلم لیگ نے بھی اپنا موقف بیان کیا اور علامہ اقبال نے واشگاف الفاظ میں اعلان
کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ ہے جو ہندوستان میں مسلم قوم کی نمائندگی کرتی ہے اقبال نے اس کانفرنس کے موقع پر وفد کے قائد جناب سر آغا خان کو نہایت مفید
مشورے بھی دیئے۔

تیسری گول میز کانفرنس: یہ کانفرنس 17 نومبر 1932ء میں شروع ہوئی اور 24 دسمبر 1932ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس میں بھی کانگریس نے شرکت نہ کی۔ اس کی
وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں نافذ کی جانے والی اصلاحات کانگریس کے پیش نظر تھیں اور کانگریس کے قائدین کو یہ خوف تھا کہ اگر کانفرنس میں شرکت کی گئی تو ہو سکتا ہے۔ برطانوی
حکومت ان اصلاحات کے پیش نظر کسی مسئلے کے حل پر مجبور کر دے۔
اس کانفرنس میں زیادہ تر ہندوستان کے آئینی معاملات پر بحث ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کانفرنس میں وفاق ہند کے بارے میں اپنا نقطہ نظر اس طرح پیش کیا کہ
ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت قائم نہیں کی جانی چاہیے بلکہ ہر صوبے کو آزاد و خود مختار بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان کی مرکزی حکومت کے بجائے براہ راست لندن
میں وزیر ہند سے ہو۔ اس کانفرنس میں بھی کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔
نتائج: گول میز کانفرنسوں کے دوررس نتائج برآمد ہوئے ان کانفرنسوں میں ہندوؤں کا موقف پوری طرح عیاں ہو گیا تھا اور مسلمان یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ
کانگریس کسی صورت میں بھی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

دستور ہند 1935:
شروع شروع میں یہ دستور جزوی طور پر نافذ کیا گیا مگر اس کا مکمل نفاذ 1937ء میں ہوا۔ اس آئین میں دوعملی نظام کا خاتمہ۔ صوبائی خود مختاری کا قیام اور ووٹ دہندگان کی
تعداد میں اضافہ اہم پہلو تھے۔ اس دستور میں ہندوستان کو وفاقی طرز حکومت دیا گیا اور وفاق کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ وفاق کی تقسیم یہ تھی۔
(۱) برطانوی ہند کے صوبے جو گورنر کے ماتحت تھے۔ (۲) چیف کمشنریاں (۳) دیسی ریاستیں
وفاق کا حاکم گورنر تھا جس کا کام ہندوستان میں امن عامہ کو برقرار رکھنا، اقلیتوں کا تحفظ کرنا اور دیسی ریاستوں کے حقوق اور والیان ریاست کے مراتب کا تحفظ کرنا تھا اس
کے علاوہ محکمہ دفاع اور امور مالیات بھی اس کی نگرانی میں تھے۔

خصوصیات:

۱۔ ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت قائم کر دی گئی۔
۲۔ وفاق میں صوبے اور ریاستیں شامل کر دی گئیں۔
۳۔ وفاق کے لئے دو ایوانی مقننہ تجویز کی گئی۔
۴۔ اسمبلیوں کے لئے نمائندوں کی تعداد مقرر کی گئی۔
۵۔ اسمبلیوں کے نمائندوں کی مدت پانچ سال ہو گئی۔
۶۔ صوبوں میں دو عملی نظام رائج کیا گیا۔
۷۔ صوبوں کو علاقائی آزادی اور خود مختاری کا حق دیا گیا۔
۸۔ دستور ہند 1935ء کے تحت سیکریٹری آف اسٹیٹ یعنی وزیر ہند کی کونسل کو ختم کر دیا گیا اور اس کی مدد کے لئے مشیر مقرر کیے گئے جس کی تعداد کم از کم 3 اور زیادہ سے

Lecturer SHAKIL ASIF ZAHOORI

زیادہ 6 مقرر کی گئی۔

۹۔ وفاقی عدالت قائم کی گئی جو ملک کی سب سے بڑی عدالت تھی اسے براہ راست مقدمات اور اپلییں سننے کا اختیار دیا گیا اور اس کے ماتحت ہر صوبے میں ایک ماتحت عدالت عالیہ قائم کی گئی۔

بہر حال ہندوستان کے عوام جس جمہوریت اور آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس دستور نے بھی پورا نہ کیا تاہم مسلم لیگی قائدین نے مصلحت کی بناء پر اسے قبول کرلیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ وقتی طور پر اس دستور سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب میں حصہ لیں۔ 1936ء میں جب اس ایکٹ کے تحت انتخابات شروع ہوئے تو تمام سیاسی جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لیا ان انتخابات میں بھی کانگریس اپنے آپ کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت ثابت نہ کر سکی۔

قراردادِ پاکستان کے اغراض و مقاصد کا تفصیلی جائزہ

قراردادِ پاکستان کا پس منظر بڑا طویل ہے۔ اس کا آغاز اس وقت ہو چکا تھا جب دسمبر 1938ء کے بعد مسلم لیگ نے وفاقی طرزِ حکومت کی تجویز مسترد کر کے لیگ کے صدر کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کیلئے کوئی بہتر اور متبادل آئینی اسکیم پیش کریں۔ اس سلسلے میں مارچ 1939ء میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا جس میں کمیٹی تشکیل دے کر جلد از جلد آئینی تجاویز پیش کرنے کا فیصلہ ہوا تاکہ مسلم لیگ کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس: قراردادِ پاکستان کے سلسلے مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس تین دن تک جاری رہا۔ 21 مارچ 1940ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں آئندہ اجلاس کی قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا کونسل کا یہ اجلاس نواب آف ممدوٹ کے گھر پر ہوا تھا۔ دوسرا اجلاس 22 مارچ 1940ء کو منٹو پارک میں ہوا جس میں نواب ممدوٹ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور خطبہ استقبالیہ پیش کیا قائداعظم نے اس اجلاس سے خطاب کیا اور سامعین کے سامنے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ پیش کیا۔ قراردادِ لاہور کا تیسرا تاریخی اجلاس 23 مارچ 1940ء کو منٹو پارک لاہور میں منعقد ہوا اس اجلاس میں حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اجلاس کی صدارت قائداعظم نے کی۔ قرارداد شیر بنگال مولوی فضل الحق نے پیش کی۔ مولوی فضل الحق اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔

قراردادِ لاہور کے مقاصد: یہ قرارداد تاریخ ساز تھی یہی قرارداد ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اس کے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ موجودہ صورت حال میں مسلمانانِ ہند کیلئے ناقابل قبول ہے۔

۲۔ حکومت برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں رد و بدل کا جو اعلان کیا ہے اس سے مسلمانانِ ہند اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک پوری آئینی اسکیم از سر نو مرتب نہ کی جائے اور ترمیم شدہ دستور بھی اس وقت تک ناقابل قبول ہوگا جب تک اس کے لئے مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری حاصل نہ کر لی جائے۔

۳۔ جن علاقوں میں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کو آپس میں ملا دیا جائے تاکہ وہاں مسلمان آزاد مملکت بنا سکیں۔

۴۔ آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں میں آباد مسلم اقلیتوں سے مشورہ لیا جائے اور دستوری خاکہ میں ان کے مفادات کی حفاظت کی ضمانت دی جائے۔

۵۔ ایسے خطے جہاں خاص طور پر مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں مناسب اور مؤثر تحفظات فراہم کئے جائیں۔

قرارداد میں یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں ان کا مذہب، تہذیب اور تصورات جداگانہ ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے مسلمان ہر اعتبار سے ایک قوم ہیں ان کا اپنا وطن اور علاقہ ہونا چاہئے جہاں وہ اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

قراردادِ لاہور کی تائید: اس قرارداد کی تائید سب سے پہلے چودھری خلیق الزماں نے کی۔ ان کے بعد دوسرے اہم رہنماؤں نے اس کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا۔ قرارداد کی تائید اور حمایت کرنے والوں میں مولانا ظفر علی خان، حاجی سر عبداللہ ہارون اور قاضی عیسیٰ پیش پیش تھے بعد ازیں قرارداد کو کثرت رائے سے منظور کر لیا گیا۔

قراردادِ لاہور کی اہمیت: قراردادِ لاہور کی منظوری سے ہندوستان کی سیاست نے نئی کروٹ لی۔ اس کی روش اور رویے میں انقلاب آ گیا۔ یہ قرارداد قیامِ پاکستان کا پیش خیمہ بن گئی اس کی منظوری سے ہندوؤں کے خواب ملیامیٹ ہو گئے اور یہ ان کی وحدت پر ضرب کاری ثابت ہوئی، ایک بار قائداعظم نے لاہور سیشن کے بارے میں اعلان فرمایا تھا کہ "مسلم لیگ سیشن اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کریگا کیونکہ اس اجلاس میں اہم فیصلے کئے جا رہے ہیں"

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

قائداعظم کا یہ فرمان پورا ہوا کیونکہ اس اجلاس کے بعد مسلم لیگ محمد علی جناح کی قیادت میں پوری آب و تاب کے ساتھ میدان عمل میں اتر آئی تھی۔ پس اس قرارداد
تصور پاکستان کو حقیقت کا روپ دے دیا۔

1942ء کرپس مشن کی سفارشات اور ہندوؤں کا رد عمل

دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی سالوں میں جرمنی کی نے برطانیہ کو ہر محاذ پر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ برطانیہ پر پڑنے والے اس دباؤ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں نے زیادہ سے زیادہ اپنے حق میں انگریز حکومت سے مطالبات منوانے کیلئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل برطانوی تاریخ میں اپنے دلیرانہ اور بروقت فیصلوں کے باعث بڑی شہرت رکھتا تھا۔ چرچل کو ہندوستان میں اٹھنے والی اس بے چینی نے بھی پریشان کئے رکھا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح ہندوستان میں امن بحال ہو اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ہو مگر متعدد کوششوں کے باوجود مشترکہ تعاون کی کوئی نئی راہ نہ نکل سکی اس کی بڑی وجہ کانگریس تھی۔ بالآخر چرچل نے برطانوی وزراء کی ایک کمیٹی بنائی جس کا نام "انڈیا کمپنی" رکھا گیا یہ مسٹر ایٹلی کی زیر صدارت میں بنائی گئی جو کہ ہندوستان کے حالات کیلئے حکومت کو تجویز پیش کرے۔ اس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مشن بھیجا جائے جو ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو کسی ایک متفق کر سکے۔ مسٹر چرچل نے ایٹلی کی یہ تجویز منظور کی اور 11 مارچ 1942ء کو مسٹر اسٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں ایک وفد ہندوستان پہنچے تاکہ اپنا کام شروع کر سکیں۔

کرپس مشن اور تجاویز: مسٹر اسٹیفورڈ کرپس نے ہندوستان آ کر حکومت اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ مذاکرات شروع کئے۔ ان مذاکرات میں تمام سیاسی جماعتوں کے سیاستدانوں نے حصہ لیا۔ 29 مارچ 1942ء کو مسٹر کرپس نے ان ملاقاتوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے ایک اخباری کانفرنس میں بتایا کہ:

۱۔ آئین ساز اسمبلی مکمل اعلان آزادی کے ساتھ شروع ہو سکتی ہے۔
۲۔ آئے ساز اسمبلی کو مکمل آزادی ہوگی کہ چاہے برطانیہ کے ساتھ ضم ہو یا نہ ہو۔
۳۔ یہ اسمبلی برطانوی گورنر کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی مجاز ہوگی۔
۴۔ ہندوستان کی ریاستوں کو آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔
۵۔ جنگ کے دوران قائم ہونے والی حکومت کو محکمہ دفاع کا محکمہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا تعلق بین الاقوامی امور سے ہے۔
۶۔ عبوری حکومت میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کو ہی کابینہ تصور کیا جائیگا۔
۷۔ ان تجاویز کو یا تو پوری طرح بروئے کار لایا جائے گا یا مکمل طور پر مسترد کر دیا جائیگا۔

اس بیان کی روشنی اور وضاحت کیلئے ہندوستان میں ایک نئے وفاق کے قیام کے لئے جو تجاویز رکھیں۔ وہ مندرجہ ذیل تھیں۔ اس کا اعلان بھی 29 مارچ 1942ء کو کیا

۱۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی ہندوستان کا دستور بنانے کیلئے ایک مجلس منتخب بنائی جائیگی جس میں ہندوستان کی ریاستوں کے نمائندے بھی شامل ہونگے اس طرح متفقہ آئین مرتب کیا جائیگا اس کی وضاحت میں کہا گیا۔ کہ اگر ہندوستان کا کوئی صوبہ نیا دستور منظور کرنے کیلئے تیار نہ ہو تو وہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت قائم رکھ سکتا ہے چاہے تو بعد میں نئے دستور میں شامل ہو سکتا ہے اور اگر وہ الحاق نہ کرنا چاہیں تو وہ اپنے آئین کے ساتھ اپنا مرتبہ علیحدہ رکھ سکتا ہے اور اس کی حیثیت انڈین یونین کی ہوگی۔

۲۔ جنگ کے خاتمے کے بعد حکومت اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے نمائندے ایک معاہدہ پر دستخط کریں گے اور دستور کی آخری شکل گفت و شنید سے دی جائیگی اس میں نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کا واضح انتظام ہوگا اور برطانوی دولت مشترکہ سے تعلقات رکھنے یا نہ رکھنے پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

۳۔ جنگ کے بعد صوبوں کے انتخابات ایوان زیریں کے ارکان متناسب نمائندگی کے تحت ایک انتخابی ادارہ قائم کریں گے۔ یہ ادارہ انتخابی ادارے کا 1/10 کے برابر ہوگا۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

۴۔ جنگ کے دوران اور نئے دستور کے بننے تک برطانوی حکومت ہی ہندوستان کے دفاع کی ذمہ دار ہوگی۔ ہندوستان کی فوجی، اخلاقی اور مادی تنظیم کے کام میں حکومت ہندوستانیوں کے تعاون سے کام کرے گی۔

اس طرح کرپس مشن میں نئے آئین کے نفاذ تک ہندوستان میں موجودہ حکومت ہی کام کرے گی۔ اس طرح برطانوی حکومت کو ہندوستان پر قبضے کو مزید طوالت کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ امر ظاہر تھا کہ تمام سیاسی جماعتیں مشکل ہی سے تمام امور پر متفق ہو سکتی ہیں اس طرح برطانوی اقتدار کو طوالت کا موقع مل جاتا تھا۔

ہندوستانیوں کا ردعمل: کرپس مشن میں یہ مشروط تھا یا تو اسے کلی طور پر منظور کیا جائے یا کلی طور پر رد کر دیا جائے۔ یہ تجاویز کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کیلئے قابل قبول نہ تھیں۔ کانگریسی اور مسلم لیگی دونوں لیڈروں نے اس پر اس طرح تبصرہ کیا مسٹر گاندھی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ وہ چیک ہے جو جنگ کے بعد کیش ہو سکے گا"

قائداعظم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ان تجاویز سے جو انتخابات کرانے مقصود ہونگے وہ تو سراسر کانگریس کو تھرتی صد بلا چوں چراں دے دینے کے مترادف ہوگا اور مسلمانوں کو کبھی اکثریت کے سامنے نہ بن پڑے گی۔"

ہندو مہا سبھا کا خیال تھا کہ ان تجاویز میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ انڈین یونین سے الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس سے تو ہندوستان کی وحدت کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے۔ اس طرح کرپس مشن تجاویز مکمل طور پر کسی بھی جماعت کیلئے قابل قبول نہ تھی کانگریس جلد از جلد اقتدار کی منتقلی چاہتی تھی جبکہ مسلم لیگ اپنے مطالبات کے بارے میں واضح فیصلے کی خواہش مند تھی اور مہا سبھا کسی بھی صورت میں ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھی وہ اکھنڈ بھارت کا تصور رکھتی تھی تقریباً یہی سوچ کانگریس کی تھی۔

کیبنٹ مشن 1946

مارچ 1946ء میں برطانوی کیبنٹ کا ایک سہ رکنی وفد جس کی قیادت ہندوستان کے سیکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ پیتھک لارنس کر رہے تھے اور سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر اراکین کی حیثیت سے ان کے ہمراہ تھے نئی دہلی آیا تاکہ ہندوستان کا تعطل میں پڑا ہوا سیاسی و آئینی مسئلہ حل کیا جا سکے۔

مقاصد:

۱۔ ہندوستانی رہنماؤں اور منتخب نمائندوں سے صلاح مشورہ کر کے نیا دستور مرتب کرنے کے لئے قابل قبول لائحہ عمل کی تیاری

۲۔ نیا دستور بنانے کے لئے دستور ساز ادارے کا قیام اور

۳۔ ایک ایسی انتظامی کونسل کی تشکیل جو تمام سیاسی پارٹیوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔

تجاویز:

۔ برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے جس کے پاس امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے شعبے ہوں۔ ان محکموں کی مالی ضروریات پوری کرنے کے لئے مرکزی حکومت کو مناسب اقدامات کا حق حاصل ہو۔

۔ مرکز میں ایک انتظامی کونسل اور مجلس قانون ساز اسمبلی تشکیل دی جائیں جن میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں کسی اہم فرقہ ورانہ مسئلے پر فیصلے کیلئے ایوان کے ممبروں کی اکثریت کی موجودگی اور دو بڑے فرقوں کی کثرت رائے ضروری ہے۔

۔ مرکزی حکومت کے متذکرہ شعبوں اور مالیتی اختیارات کے علاوہ باقی تمام اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ اسی طرح ریاستوں کے پاس بھی تمام اختیارات ہوں سوائے ان امور کے جو مرکز کے حوالے کئے گئے ہوں۔

صوبوں کو گروپ سازی کی آزادی ہو جن کی اپنی عاملہ اور دستور ساز اسمبلیاں ہوں۔

ہر گروپ کی انتظامیہ اپنے صوبوں کے ساتھ مشترکہ صوبائی امور کا تعین کرنے کی مجاز ہو۔

مرکزی اور صوبائی دساتیر میں یہ شق شامل ہو کہ کوئی بھی صوبائی اسمبلی ابتدائی دس سال اور بعد ازاں ہر دس سال کے بعد کثرت رائے سے دستور کے مندرجات پر نظر ثانی

کرنے کا فیصلہ کر سکے۔

مذکورہ بالا تجاویز کے لحاظ سے صوبوں کی گروپ بندی کرنے کا یہ طریقہ کار متعین ہوا۔

گروپ اے: مدراس، بمبئی، یوپی، سی پی، بہار اور اڑیسہ (ہندو اکثریتی گروپ)

گروپ بی: پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ (مغربی مسلم اکثریتی گروپ)

گروپ سی: بنگال اور آسام (مشرقی مسلم اکثریتی گروپ)

3 جون کا منصوبہ (1947ء)

مارچ 1947ء میں لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ اس کے تقرر کو کانگریس نے زبردست خوش
کیونکہ ماؤنٹ بیٹن سے کانگریس کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ ہندوستانی لیڈروں سے کئی کانفرنسوں کے بعد ماؤنٹ بیٹن لندن گئے اور برطانوی حکومت سے
منصوبہ پر مشورہ کر کے 2 جون 1947ء کو واپس آئے اور ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات کی اور 3 جون کو ایک نئے منصوبے کا اعلان کیا۔ اپنی نشری تقریر میں انہوں
کہ انہیں بڑا افسوس ہے کہ ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی منصوبہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا واحد حل صرف یہ ہے کہ برطانوی اقتدار
حکومتوں کے سپرد کر دیا جائے جس سے ہر ایک کو ڈومینین کی حیثیت حاصل ہو اور اقتدار کی یہ منتقلی آئندہ چند مہینوں میں عمل میں آئے گی۔

خصوصیات:

۱۔ برصغیر کے وہ سارے علاقے جن کی موجودہ قانون ساز اسمبلی میں نمائندگی نہ ہو انہیں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آیا ان کا آئین موجودہ قانون ساز اسمبلی تیار کرے گی یا نئی
ساز اسمبلی یہ کام کرے گی۔

۲۔ بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلی کو دو حصوں میں ایک مسلم اکثریتی علاقہ کی نمائندہ اور دوسرے ہندو صوبہ کی نمائندہ کو آپس میں ملاقات کرنا چاہیے اور بر حصہ کو
ووٹ کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان صوبوں کی تقسیم ہونا چاہیے یا نہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک تقسیم کے حق میں فیصلہ کرے تو اس پر اسی طرح عمل کرنا چاہیے
سلسلہ میں اضلاع کی آبادی کے تعین کے لئے 1941ء کی مردم شماری کو مستند سمجھا جائے گا۔

۳۔ سندھ کی قانون ساز اسمبلی کی صوابدید پر یہ بات منحصر ہوگی کہ وہ چاہے تو موجودہ قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرے یا نئی قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرے۔

۴۔ شمال مغربی صوبہ سرحد کے عوام استصواب رائے کے ذریعے اس بات کے لئے ووٹ دیں گے کہ وہ کس قانون ساز اسمبلی میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔

۵۔ آسام کے ضلعی سلہٹ میں بھی وہی طریقہ کا اختیار کیا جائے جو صوبہ سرحد میں اختیار کیا گیا ہو۔

۶۔ بنگال، پنجاب اور سلہٹ اگر نئی قانون ساز اسمبلی کے حق میں فیصلہ دیں تو وہاں مسلم اکثریتی علاقوں کی سرحدوں کے تعین کے لئے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کیا جائے۔

۷۔ اگر بنگال، پنجاب اور سلہٹ نئی قانون ساز اسمبلی میں شراکت کے حق میں فیصلہ دیں تو پھر ایک ملین آبادی کے لئے ایک نمائندہ کے اصول پر ان علاقوں میں نئے
سے انتخابات کرائے جائیں۔

۸۔ قبائلی علاقوں کے بارے میں معاہدہ کرنے کے لئے آئندہ بننے والی اتھارٹی سے گفت و شنید کی جائے گی۔

۹۔ ہندوستانی ریاستوں کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

۱۰۔ مجالس قانون ساز کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ چاہیں تو برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہیں یا اگر پسند کریں تو مکمل طور پر آزاد ہو جائیں۔

قانون آزادی ہند 1947ء

اس مسودہ قانون کو برطانوی وزیر اعظم ایٹلی نے خود 4 جولائی کو دارالعوام میں پیش کیا۔ 15 جولائی کو دارالعوام نے اور 16 جولائی کو دارالامراء نے اس کو منظور کر لیا۔ اس میں
کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ 18 جولائی کو اسے شاہی منظوری حاصل ہوگئی اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے پاس ہونے کے تقریباً 12 سال بعد یہ آزادی ہند کا بل
منظور ہو گیا جس کے ذریعہ تقسیم ہند کا فیصلہ ہوا اور ہندوستان کی دو ڈومینین یعنی پاکستان اور ہندوستان وجود میں آئیں (جس کے لئے 15 اگست 1947ء کی تاریخ مقرر

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

ہوئی)۔

خصوصیات:

۱۔ دونوں ڈومینین میں قانون سازی کی بالادستی۔

۲۔ دونوں ڈومینین کی قانون ساز اسمبلیوں کو اس بات کے مکمل اختیارات دیے گئے کہ وہ اپنے حلقہ اختیار والے علاقے کے لئے قانون سازی کریں۔

۳۔ برطانوی حکومت کو ڈومینین کے معاملات پر 15 اگست 1947ء کے بعد کوئی بالادستی حاصل نہ ہوگی اور نہ صوبوں پر یا ڈومینین کے کسی حصہ پر۔

۴۔ جب تک ہر ڈومینین کے لئے کوئی نیا آئین بنایا جاتا تب تک وہ موجودہ دستور ساز اسمبلیوں اور ڈومینین کی قانون ساز اسمبلیوں کے تابع رہیں گی تمام اسمبلیاں وہ سارے اختیارات استعمال کریں گی جو گزشتہ دور میں مرکزی قانون ساز اسمبلی استعمال کرتی تھی اس کے علاوہ اسے اختیار ہوگا کہ وہ ایک نیا آئین بنالے۔

۵۔ نئے آئین کے بننے تک ہر ایک ڈومینین اور تمام صوبوں پر حکومت ہند کے ایکٹ 1935ء کے تحت حکومت کی جائے گی۔ ہر ڈومینین کو اختیار ہوگا کہ وہ (اپنی ضرورت کے تحت) اس ایکٹ میں قانون آزادی ہند 1947ء کی روشنی میں ترامیم کرے۔

۶۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اگر ضروری سمجھے تو 31 مارچ 1948ء تک حکومت ہند کے ایکٹ 1935ء میں تبدیلی یا ترامیم کرے اس تاریخ کے بعد قانون ساز اسمبلی کو یہ اختیار ہوگا کہ حکومت ہند کے ایکٹ 1935ء میں ترمیم کرے یا اس ایکٹ کو اپنا لے۔

۷۔ تاج برطانوی کا قوانین کے بارے میں حق تنسیخ (ویٹو) جو شاہ کی خوشنودی کے لئے ہوتا تھا وہ منسوخ ہوگیا اور اب یہ حق گورنر جنرل استعمال کر سکے گا۔ اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ کے نام سے ڈومینین کے لئے کوئی قانون ڈومینین کی قانون ساز اسمبلی میں عمومی قانون سازی کے اصول پر وضع کرلے۔

۸۔ ایکٹ کے ذریعہ تاج برطانیہ کی ہندوستانی ریاستوں پر بالادستی اور تسلط کا خاتمہ کر دیا گیا۔ سارے معاہدے، راضی نامے اور افعال جو شاہ برطانیہ کی نسبت سے تھے جن کا تعلق ان ریاستوں سے تھا یا ان کے حکمرانوں سے متعلق تھا وہ سب 15 اگست 1947ء سے منسوخ سمجھے جائیں گے۔

۹۔ صوبہ سرحد کے قبائل سے آئندہ بننے والی ڈومینین معاہدات کرے گی۔

۱۰۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند کا عہدہ ختم کردیا گیا۔

۱۱۔ "شہنشاہ ہند" کے لقب کے بجائے اب تاج برطانیہ "شاہ انگلستان" ہوگا۔

۱۲۔ اس ایکٹ نے برطانوی حکومت کی ہندوستان پر بالادستی اور تسلط کو ختم کر دیا اور اس کے ذریعہ دو ڈومینین بنادی گئیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی سوابدید پر آئین سازی کے مکمل اختیارات دے دئے گئے۔ دونوں ڈومینین کو یہ اختیارات بھی دیئے گئے کہ وہ جب چاہیں برطانوی دولت مشترکہ کو چھوڑ سکتے ہیں۔

نتائج: 20 جولائی کو ہندوستان اور پاکستان کے لئے علیحدہ علیحدہ صوبائی حکومتیں بنادی گئیں۔ 7 اگست کو جناح نے آخری بار ہندوستان چھوڑ دیا اور کراچی کے لئے پرواز کر گئے جو پاکستان ڈومینین کا دارالخلافہ بنا۔ 11 اگست کو پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اور اس میں جناح صاحب کو صدر منتخب کیا گیا۔ 13 اگست کو ماؤنٹ بیٹن کراچی آئے اور 14 اگست کو قانون ساز اسمبلی سے خطاب کیا۔ 15 اگست 1947ء کو جناح نے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا اور نئی پاکستانی کابینہ نے حکومت سنبھال لی۔

پاکستان ناگزیر تھا؟

قیام پاکستان کے اہم اسباب یا برصغیر کے مسلمانوں نے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں کیا؟

جیسا کہ قائداعظم نے فرمایا "پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔" ایک ہندو فرد کا اسلام قبول کرنا بظاہر کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔ اصل اہمیت ایک نئے نظریے کی آمد ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ تھا جس نے ایک نیا رویہ اخلاقیات کا ایک نیا ضابطہ ایک نئی ثقافت اور ایک نیا عالمی منظر متعارف کرایا اس نئے نظریے نے ایک ایسے نئے معاشرے کو جنم دیا جس کی بنیاد بھائی چارے کے اصول پر تھی جس سے انسانیت اس سے پہلے واقف نہ تھی۔

سیاسی عوامل: سیاسی استحکام اور راج جمہوری نظام وہ اہم عوامل تھے جو تخلیق پاکستان کا باعث بنے۔ وہ سیاسی عوامل جنہوں نے مسلم قوم پرستی کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا ان کا تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

ہندو قوم پرستی اور ہندو سیاست [illegible] 1883 [illegible]
تحریک [illegible] مسلمانوں کی مخالفت [illegible]
[illegible] تحریک کی بنیاد [illegible]
[illegible] اسلام اور سیاست [illegible]
[illegible] اسلام کے [illegible] ہندو [illegible]
مسلمان [illegible]
حالت میں تبدیل کرنا تھا جو مسلمان سے [illegible] کانگریس کا اہم ترین [illegible]
دیا۔

تاہم کوئی تحریک ہندو قوم پرستی کے ہندوانہ روئیے کی اتنی وضاحت [illegible] نہیں کرتی جتنا وہ احتجاج کرتا ہے جو ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف 1905ء سے 1911ء کے درمیان کیا۔ اس تحریک میں مذہب و سیاست کا بہترین امتزاج پایا گیا۔ سریندر ناتھ بنرجی، جو کانگریس کے ابتدائی لیڈروں میں سے ایک تھے نے [illegible] کوئی مذہبی تقریب منعقد کریں مثلاً شکتی پوجا، (شکتی دیوی کی پوجا) یا کالی پوجا (تباہ کاری کی دیوی کالی ماتا کی پوجا) [illegible] (ایمان اعمال) [illegible] کہا کہ تحریک کو مذہبی رنگ دے دو اور اگر مسلمان ساتھ دیں تو سودیشی پرچار کے بعد وعظ اور تبلیغ کی جائے۔

بندے ماترم ہندوؤں کا انقلابی ملی نغمہ یا نظم تھی جو بنکم چندر چیٹرجی کے ناول آنند مٹھ (راہبوں کی آماجگاہ) میں شامل تھی جس سے انگریزوں اور مسلمانوں کے خلاف جذبات بھڑکانے اور ان دو قوموں کو ہندوستان سے نکالنے کی ترغیب شامل تھی۔ یہ نغمہ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے انتہائی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ تھا [illegible] نے قومی ترانہ کے طور پر اپنایا اور اسے ہر قسم کے اجلاس اور قانون ساز اسمبلی کے افتتاحی تقاریب میں گایا جانے لگا۔ مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود یہ 1947ء تک [illegible] نغمہ رہا۔

کانگریس کا ہندوانہ کردار اس کی کئی پالیسیوں سے ظاہر ہوتا ہے در حقیقت کانگریس بنیادی طور پر ہندو ازم کا ہی سیاسی آلہ تھی۔ اس نے ہندو ازم کی بنیاد پر لوگوں [illegible] راغب کیا اور ہندو انڈیا کے لئے کام کیا۔ مسلمانوں نے گاندھی کے نظریات مسترد کر دیا کیونکہ وہ ہندوستان کی ترقی کی بنیاد ہندو ازم اور ہندو نظریے کے تحت [illegible] چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو یہ خوف تھا کہ متحدہ ہندوستان میں انہیں برتر ہندو اکثریت کا سامنا کرنا پڑے گا، ایک [illegible] مملکت کے مطالبے کے پیچھے یہی بنیادی [illegible] کار فرما تھا [illegible] پر بھروسہ نہیں کرتے تھے اور جہاں بھروسہ نہ ہو وہاں تعاون نہیں ہوتا اور جہاں اتحاد نہ ہو وہاں قومی یکجہتی نہیں ہوتی۔

ہندو مسلم خلیج: 1908ء میں کانگریسی رہنما جی کے گوکھلے نے ولفریڈ بلنٹ کو بتایا کہ تمام مسلمان کانگریس کے خلاف ہیں اور قومی بنیادوں پر ہندوستان کی تعمیر [illegible] بن سکتے ہیں کیونکہ تعداد میں وہ کم اور غریب ہونے کے باوجود متحدہ ہیں۔ وہ طرز جس سے سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر کیا [illegible] میں اپنی بھرپور شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا۔ تمام وفود اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان کو آزادی دے دینی چاہیے لیکن اس کے علاوہ کسی ایک [illegible] نظر نہ آتا تھا۔ ہر وفد کا دہرا کردار تھا۔ ایک طرف تو وہ قوم پرست ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے ہندوستان کی آزادی چاہتے تھے جبکہ دوسری طرف وہ بطور ہندو یا [illegible] ہم مذہبوں کیلئے زیادہ مفادات کے حصول کیلئے کوشاں تھے۔ بطور قوم پرست یہ وفود ایک ہو جاتے تھے جبکہ ہندو اور مسلمان کے طور پر ایک دوسرے کے حریف [illegible] سے خوفزدہ اور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مسلمانوں کی علیحدگی کا تصور خود کانگریس کے منشور کی ایک مشق میں موجود تھا جس میں پورے ہندوستان کیلئے نشستیں تفویض کرتے ہوئے [illegible] کمیٹی نے بیان کیا [illegible] تک ممکن ہو تو ہندوؤں کی کل تعداد کا پانچواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ 1946ء کے اواخر میں کانگریس کی ایک نیم سرکاری تاریخ میں اعتراف کیا گیا کہ [illegible] اتحاد اب محض ایک خواب ہے۔

جداگانہ انتخابات: 1892ء کے انڈین کونسل ایکٹ میں نمائندگی اور انتخابات کا اصول متعارف کرایا گیا۔ اصلاحات کی ایک اور قسط بھی متوقع تھی اور اس وقت [illegible] جاری تھی کہ انتخابی دائرہ کار میں مزید وسعت دی جائے گی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ ان کے مفادات کا تحفظ لازمی طور پر ہونا چاہیے چنانچہ مسلمانوں کا ایک وفد [illegible] لارڈ منٹو سے یکم اکتوبر 1906ء کو ملا اور مسلمانوں کیلئے تمام انتخابی مجالس میں جداگانہ انتخابات اور ووٹ کے اصول کا مطالبہ کیا۔ وائسرائے ان کے مطالبات منظور [illegible] شملہ وفد جدید مسلم انڈیا کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے مستقبل کیلئے ایسی اسمبلیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے جو ایک ہندوستانی قوم کی [illegible]

منتخب ہوئی ہوں اس طرح انہوں نے واحد ہندوستانی قوم کا نظریہ مسترد کر دیا۔ مسلمانوں کا زور اس بات پر تھا کہ وہ ہندوستانی قوم کے جز کے طور پر خود کو محفوظ محسوس نہیں
کرتے۔ یہ یقینی طور پر دو قومی نظریے کا اعلان تھا۔

مذہبی عوامل: جب سے دنیا وجود میں آئی ہے مذہب افراد اور گروہوں کے مابین ایک طاقتور تعلق رہا ہے۔ فرقہ وارانہ سالمیت اور قومی اتحاد اکثر مذہبی بنیادیں رکھتے ہیں۔
تشکیل فکر میں مذہب انتہائی محرک کردار ادا کرتا ہے درج ذیل پیراگراف میں ہم علیحدہ مملکت کے مطالبے پر مذہب کے اثرات پر بحث کریں گے۔

ہندوازم اور ہندوستانی قومیت پرستی: ابتوائی ہندوستانی قومیت پرستی مذہبی (ہندو) اور نسلی (برطانیہ مخالف) تھی۔ آریا سماج ہندوازم کی ابتدائی تریب جدید تحاریک میں
سے ایک تھی جو جلد ہی ایک سیاسی قوت بن کر ابھری جس نے اسلام اور عیسائیت کی شدید منافرت کے ساتھ مخالفت کی۔ کانگریس کا مکمل روپ ہندوانہ تھا۔ گاندھی کا جدید
نوآبادیاتی نظام کے خلاف سب سے اہم ہیھیار عدم تشدد (اہنسا) تھا۔ وہ اسے ہندوؤں کے فلسفہ حیات کا اظہار سمجھتے تھے۔ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہندومت کو زندہ رکھنے اور
ہندوستان کو غیر منقسم رکھنے کا واحد راستہ تھا۔ اسی طرح گاندھی نے گئو رکھشا کو ہندو قلب کی سب سے عزیز خواہش ہندومت کی مرکزی حقیقت اور دنیا کے لئے ہندومت کا تحفہ
قرار دیا۔ بندے ماترم ایک شدید مسلم مخالف گیت تھا جسے کانگریس نے ہندو نیشنلزم کی علامت کے طور پر اپنایا اور پھر بھی کانگریس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی علامت
ہے اور کانگریس کو اس بات پر افسوس تھا کہ مسلمان نہ تو ان کی صفوں میں شامل ہوتے ہیں۔ نا ہی ان کے نظریات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس قسم کی قوم پرستی
سے وابستہ ہونے سے انکار کر دیا۔ انہیں مذہب کی بنیاد پر علیحدگی کا دعویٰ کرنے پر سخت مطعون کیا گیا۔ انہیں پسماندہ اور قدیم لوگ کہا گیا جواب بھی مذہب کی طرف سنجیدگی
سے دیکھتے ہیں اور جنہوں نے جدید اور سیکولر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جناح نے صاف طور پر بتایا کہ وہ ایک مسلمان ہیں اور صرف مسلمانوں کے حکمران ہیں اور یہ کہ اسلام
ان کی قومیت کی بنیاد ہے۔

تحریک خلافت: کوئی دوسری چیز سیاست میں مذہبی جذبات کے کردار کو اس حد تک واضح نہیں کرتی جتنا ترکی کے سلطان کی حمایت میں چلائی جانے والی مختصر المعیاد لیکن
انتہائی پر جوش تحریک خلافت۔ تحریک خلافت بنیادی طور پر مذہبی تحریک تھی اگرچہ اس کی تہہ میں ایک بہت مضبوط سیاسی محرک تھا جس نے ہندوستانی نیشنلزم کی قدیم روایت کو
تباہ کر دیا۔ اس کا سبب ہندو مسلم اتحاد تھا جو تحریک خلافت کے خاتمے تک جاری رہا۔ تاہم آخری جنگ جیتنے سے پہلے ہی اس دوستی میں دراڑیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ بہت
سے مسلمانوں نے ایک اہم سبق سیکھا کہ ہندو مسلم اختلافات کی خلیج اتنی گہری ہے کہ اس پر جذباتی دوستی سے یا سیاسی میدان میں مشترکہ لائحہ عمل سے پل نہیں بنایا جا سکتا۔
بعد از اں علیحدہ نمائندگی کے مطالبے کی بنیاد بھی اس دعوے پر رکھی گئی کہ ان کا مذہب انہیں دیگر ہندوستانیوں سے جدا اور مفرد بناتا ہے۔ تاہم اب انہوں نے شدت کے
ساتھ یہ محسوس کیا تھا کہ وہ مسلمان پہلے ہیں اور ہندوستانی بعد میں۔

فلسفہ: ہر قوم کا اپنا ایک فلسفہ ہوتا ہے جو قومیت کی تشکیل کیلئے از حد ضروری تو نہیں ہوتا تاہم یہ قومی مقصد اور نظریے کو قوت بخشتا ہے۔ ہندوستان میں ہندو اپنے قدیم فلسفے کی
طرف دیکھتے تھے بالکل اسی طرح جیسے مسلمان اپنی دانش اور فلسفہ کیلئے مسلمان مفکرین مثلاً ابن سینا اور امام غزالی کی طرف دیکھتے تھے۔ جب ہندو اپنے ماضی کو یاد کرتا تھا تو وہ
کوٹلیا (ارتھ شاستر کا مصنف) کی طرف دیکھتا تھا۔ جن مسلمان پیچھے کی طرف دیکھتا تھا تو وہ الفارابی کو آواز دیتا تھا دونوں کا فلسفیانہ ماضی اتنا زیادہ مختلف تھا کہ دونوں قوموں کو
قریب لانا ناممکن تھا۔

ثقافتی عوامل: ثقافت دراصل "ذہنی تعمیر" ہے۔ انسان کے ذہن میں ہوتی ہے اور ان کے طرز فکر طرز حیات اور کردار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم بنیادی طور پر
ثقافتی علیحدگی کی قوتوں کا نتیجہ تھی۔

ثقافت اور قومیت: ہندوستان میں مذہب کو ثقافت پر فوقیت حاصل تھی مگر یہاں بھی ثقافت خود مذہب پر انحصار کرتی تھی ہندوستانی مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ ان کی ثقافت مختلف
ہے کیونکہ یہ ایک مسلم ثقافت ہے۔ دونوں ثقافتوں کا پس منظر اور نفس مضمون ایک دوسرے سے اتنے مختلف تھے کہ ان پر عمل پیرا کبھی ایک مشترکہ معاشرے کو جنم نہیں دے
سکے۔ درحقیقت علیحدگی کی جڑوں میں یہ ثقافتی اختلاف اہم کردار ادا کر رہا تھا۔

زبان: زبان کسی قوم کی بنیادی خصوصیت نہیں ہوتی تاہم یہ ان خصوصیات میں سے ایک ہے جس سے ایک قوم خود کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے یا ان بنیادوں میں سے ایک
ہے جن پر قومیت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ برصغیر میں اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ 1867ء میں بنارس کے کچھ ہندوؤں نے ازدو ہندی
تنازعہ شروع کیا جس نے مستقبل کی سیاسی سرگرمیوں کے رخ کا تعین کیا ہندوؤں نے اردو کی جگہ ہندی کو عدلتی زبان کے طور پر رائج کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جیسے جیسے سیاسی اور
ثقافتی اختلافات بڑھتے گئے دونوں زبانیں ایک دوسرے سے دور ہوتی گئیں۔ ہندی کے حمایتی اسے قومی رتبہ دینا چاہتے تھے جبکہ مسلمان اس سے منکر تھے جیسے جیسے یہ تنازعہ

بڑھتا گیا دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مزید دور ہوتی چلی گئیں۔ کانگریس نے خود کو ہندی سے وابستہ کرلیا اور جب کانگریسی وزارتیں اقتدار میں آئیں تو ان پر مسلمانوں کا ایک بڑا الزام ہی یہ تھا کہ یہ وزارتیں ہندی کو اردو کے مقابلے میں آگے لانے ترقی دینے اور اردو پر مسلط کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ودیا مندر اسکیم کی ہندی کی تعلیم سے وابستگی ان وجوہات میں سے ایک تھی جس کی بنا پر مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔ کانگریس کے بمبئی میں ہندی میڈیم ٹیکسٹ بکس کے استعمال پر زور دینے نے اس اختلاف کو مزید بڑھاوا دیا۔

تعلیم: دیگر میدانوں کی طرح تعلیم میں بھی مسلمانوں کے آئیڈیل ہندوؤں سے مختلف تھے۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی قدامت پرستی نے انہیں سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے دور کردیا۔ مسلمان اپنے بچوں کو ان روایتی کتبوں اور مدرسوں میں بھیجنے پر اصرار کرتے رہے جہاں تعلیم صرف مذہبی تعلیمات تک محدود تھی۔ مدرسوں میں بنیادی حسابات تاریخ اور جغرافیہ بھی پڑھایا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے انگریزی زبان کو نہیں اپنایا اس طرح انہوں نے خود کو دانشورانہ اور مادی ترقی سے دور کر لیا کیونکہ سرکاری ملازمت صرف انگریزی زبان جاننے والے ہی کر سکتے تھے۔

مسلم ہندوستان میں نیشنلزم کا کردار علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ کے مطالعے سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ جدید یونیورسٹی کا ایک اہم مقصد قومیت کی تخلیق و ترقی میں تعلیم یافتہ لوگوں کے کردار کو بڑھانا بھی تھا۔ علی گڑھ علم و آموزش کے میدان میں مسلم قومیت کی علامت تھا۔ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم کی گئی مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کیلئے اس نے ایک مختلف کردار ادا کیا۔ سے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا واحد مرکز تھا جہاں تعلیم اردو میں دی جاتی تھی یہاں ایک بہت بڑا ترجمے کے لئے ادارہ قائم کیا گیا تھا جس نے ادب فلسفہ سائنس تاریخ سیاسیات اور معاشیات کے مغربی کلاسکی علوم کا اردو میں ترجمہ کیا۔

یونیورسٹیوں کے علاوہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے کالج اور کچھ شہروں میں ایسی سوسائٹیاں اور ایسوسی ایشنز قائم کیں جنہوں نے اسکول اور کالج قائم کئے۔ ہندو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے مخالف تھے کیونکہ ہندو مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہ مسلمانوں کو ثقافتی اعتبار سے پسماندہ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سیاست کی طرح ثقافت میں علیحدگی پسندی مسلم ذہن میں گھر کرتی گئی۔

آرٹ: جمالیاتی میدان میں مختلف قومیں مختلف النوع آرٹ کی حامل ہوتی ہیں۔ مسلمان مغلیہ تعمیرات کو اپنے فنی ورثہ کے طور پر دیکھتے تھے۔ آگرہ کا تاج محل ہو یا دہلی کا لال قلعہ یا لاہور کی شاہی مسجد یہ سب ان کے تصورات کی عکاسی کرتے اور فخر و مباہات کا باعث بنتے تھے۔ دوسری طرف ہندو جنوبی ہندوستان کے قدیم مندروں کے طرز تعمیر سے راجپوت یا کانگڑہ اسکول آف پینٹنگ سے یا گندھارا اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر سے اسی طرح متاثر تھے جو یقینی طور پر اپنی بنیاد اور ساخت کے لحاظ سے مکمل طور پر ہندووانہ تھے۔

تحریک پاکستان کا پس منظر

برصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور اپنے اس پورے دور میں ہندوؤں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک سے کام لیا مگر مسلمانوں کی رواداری اور حسن سلوک کے باوجود ہندوؤں کو جب بھی موقع ملا تو انھوں نے مسلمانوں کے خلاف بغاوت بلند کردیا اور مسلمانوں پر ظلم توڑے۔ 712ء میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کر کے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی باقاعدہ بنا در کھی۔ محمد بن قاسم کے دور میں ہندوؤں، بدھوں اور دوسری غیر مسلم اقوام کی پوری طرح مذہبی آزادی دی گئی اور ان کی بت پرستی کے باوجود انھیں ذمیوں کا درجہ دیا گیا۔

غزنوی خاندان: غزنوی حکمرانوں کے دور میں برصغیر پاک و ہند پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کے علاقے کو اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا اس نے یہاں کے ہندوؤں، سکھوں اور بدھوں کے ساتھ اس قدر رواداری کا سلوک کیا کہ اس نے اپنی فوج کے ہندو کمانڈر "تلک" کو اس علاقے کا نگران بنادیا۔ ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا اور انھیں مذہبی آزادی دی لیکن اس کے باوجود ہندوؤں نے محمود غزنوی کی وفات کے بعد خود مختاری کا اعلان کر دیا اور یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ نہایت ہی ناروا سلوک کیا۔ اور مساجد کی محرابوں میں بت رکھ دیئے۔

غوری خاندان: غزنوی خاندان کے بعد غوری خاندان نے ہندستان کا رخ کیا۔ شہاب الدین غوری نے ہندوستان میں ایک مستحکم اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی اور قطب الدین ایبک کو اس کا حکمران بنادیا اور خود غزنوں واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی قنوج کے راجہ جے چند نے سرکشی اختیار کرلی جسے اس نے دوبارہ آکر شکست دی اس طرح ہندوؤں اور سکھوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ انھوں نے 1206ء میں محمد غوری کو قتل کرادیا۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

سلاطین دہلی: سلاطین دہلی کا دور خاندان غلاماں سے لے کر لودھی خاندان تک شمار کیا جاتا ہے۔ سلاطین دہلی میں پہلا حکمران قطب الدین ایبک تھا جو 1206ء میں حکمران بنا۔ سلاطین دہلی نے ہندوؤں کے ساتھ دلی کا ثبوت دیا۔ انہیں سرکاری ملازمتوں پر تعینات کیا انہیں مذہبی آزادی دی۔ مگر ہندو تمام مراعات کے باوجود مسلم حکومت کے راستے میں مشکلات کھڑی کرتے رہے۔ جب 1221ء میں برصغیر کی سرحدوں پر منگولوں کے حملے جاری تھے تو دوآبہ کا علاقہ ہندوؤں کی سازشوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں 1226ء میں اودھ کے ایک ہندو زمیندار نے ایک ہزار مسلمانوں کو شہید کر کے ہندوستان کو دوبارہ "آریہ ورت" بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ خلجیوں کے دور اقتدار کے تعد ہندوؤں نے برصغیر میں اپنی حکومت قائم کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

تغلق خاندان: خلجیوں کے بعد ہندوستان پر تغلق خاندان برسر اقتدار آیا غیاث الدین تغلق، محمد تغلق اور فیروز تغلق نے برصغیر میں امن پسند معاشرہ قائم کیا اور تمام فرقوں کو بلا امتیاز مذہبی آزادی دی اور ان کے ساتھ اعلیٰ درجے کی رواداری برتی لیکن اس کے باوجود ہندو ذہنیت بہ بدلی اور انھوں نے فیروز شاہ تغلق کے آخری دور میں شورشیں برپا کر دیں۔ تغلق خاندان کے آخری حکمران محمود تغلق کے زمانے میں امیر تیمور نے دہلی پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر دیا اور اس طرح ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو گیا، ہندوؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ہندو ریاست "وجیانگر" قائم کر لی اور اس علاقے میں اسلام کی اشاعت روک دی۔ مسلمان ہندوؤں کی سختی سے تنگ آ کر دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔

لودھی خاندان: تغلق خاندان کے بعد ہندوستان میں 1441ء میں لودھی خاندان حکمران بنا۔ اس خاندان میں بہلول لودھی، سکندر لودھی اور ابراہیم لودھی نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ نہاتھ عمدہ سلوک کیا اور انھیں ہر طرح کی مراعات دیں مگر ہندو اور دکھا پی شرارتوں سے باز نہ آئے۔ اس ہندوؤں نے بغاوتیں کیں۔ اور مسلمانوں پر ظلم توڑے۔ اسی دور میں بہار کے علاقے میں ایک ہندو نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانا شروع کر دیا تھا جن مسلمانوں نے ہندو بننے سے انکار کیا انہیں شہید کرا دیا گیا۔ ابراہیم لودھی کے عہد میں میواڑ کے حکمران "رانا سانگا" نے برصغیر میں اپنی حکومت قائم کرنے کا منظم منصوبہ بنایا اور اس نے راجھستان کے علاقے میں مسلمانوں پر حملے بھی کئے۔

مغل خاندان: لودھی خاندان کے بعد 1526ء میں دہلی کی حکومت مغلوں کے قبضے میں آ گئی۔ بابر نے ابراہیم کو شکست دے کر ہندستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ بابر کو رانا سانگا نے چین نہ لینے دیا۔ وہ 1526ء میں بابر سے مقابلے کے لئے کنوایہ پہنچ گیا مگر بابر نے اسے عبرتناک شکست دی اگر خدانخواستہ رانا اس وقت کامیاب ہو جاتا تو وہ ہندوستان سے مسلمانوں کا نام تک مٹا دیتا۔

اکبر کے عہد میں ہندوؤں نے اس قدر زور پکڑا کہ وہ مسلمانوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے اور بعض علاقوں میں ان کا اتنا اثر تھا کہ مسلمان اپنے مذہبی فرائض پورا کرنے سے قاصر ہو گئے تھے اور ہندوؤں نے کئی ایک مساجد پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس ظلم و تشدد کے دور میں خداوند لازوال نے حضرت مجدد الف ثانی کو مسلمانوں کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا۔ مجدد الف ثانی نے مسلمانوں کو گمراہی سے نجات دلانے کے لئے اپنی تحریروں اور تقریروں سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے پیش کی اور ہندوستان میں غیر اسلامی نظریات کے خلاف آواز اٹھائی۔ پورے مغلیہ دور میں ہندوؤں کی بدمعاشیاں جاری رہیں اور اورنگزیب کی وفات کے بعد سکھوں اور مرہٹوں نے ہندوستان پر قبضے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر بروقت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دے کر مرہٹوں کی گوشمالی کرا دی۔

ہندوستان پر مسلمانوں نے عرصہ دراز تک حکومت کی ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ رہے مسلمان بادشاہوں نے ایک دن بھی ہندو رعایا کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ان کی رعایا ہیں یا انسانی رشتہ میں وہ ان سے کمتر ہیں یا علمی اور ثقافتی اعتبار سے وہ ان سے چھوٹے درجے کے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں کسی ہندو کو زبرستی مسلمان نہیں بنایا۔ ان کے رسم و رواج پر کوئی پابندی نہیں لگائی لیکن جب ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں کے محکوم ہو گئے تو مسلمانوں کو پتہ چلا کہ ہندو الگ پر راج کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہندوؤں نے انگریزوں سے وفاداری کا حلف دے دیا۔ انگریزوں نے بھی ان سے دوستی کر لی۔ پس اس طرح انگریز اور ہندو دونوں مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

انگریزوں کی آمد: برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں نے سینکڑوں سال تک حکومت کی لیکن جب مسلمان حکمران عیش و عشرت کی زندگی گذارنے لگے اور رعایا کے حالات سے چشم پوشی کرنے لگے تو سمندر پار سے آئے ہوئے انگریزوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا پروگرام بنا لیا اور وہ آہستہ آہستہ ہندوستان میں اپنے قدم جمانے لگے یہاں تک کہ 1857ء میں سلطنت مغلیہ کے باقی ماندہ آثار بھی مٹا دیئے گئے اور انگریز برصغیر پاک و ہند کے حکمران بن بیٹھے۔

اسلامیانِ ہند کی تاریخ میں 1857ء ایک اہم سنگِ میل ہے کیونکہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کی وجہ سے مسلمانوں کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ حاکم سے

محکوم بن گئے ان کی جاگیرداریں اور عہدے چھین لیے گئے اور دنیاوی اعتبار سے ان کی ترقی کے تمام راستے بند کر دیے گئے اس طرح مسلمان شدید قسم کے معاشی اور
بحران کا شکار ہو گئے یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا تاریک ترین تھا لیکن اسی تاریک دور میں امید کی ایک کرن پھوٹی جس نے اسلامیان ہند کو سہارا دیا مستقبل پر کامران
سرسید احمد خان کی شخصیت تھی۔

سرسید احمد خان: سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا بغور جائزہ لے کر ایک ٹھوس لائحہ عمل پیش کیا اس لائحہ عمل کا مقصد مسلمانوں کو بیدار کر کے ترقی کی راہ پر
گامزن کرنا تھا۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور اس مقصد کے لیے اسکول، کالج اور سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ مجموعی طور پر انہوں
ایسی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو جو میدان کے لیے تیار کرنا تھا اصلاحی تحریک کا نام تحریک علی گڑھ ہے۔

سرسید احمد خان وہ پہلے سیاست دان ہیں جنہوں نے ہندوستان کی سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ انہوں نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ ہندو اور مسلمان متحد نہیں
کیونکہ دونوں کا مذہب، تہذیب اور تمدن ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ 1868ء کے بعد ہندوستان میں ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے سرسید احمد خان کو ہندو پر
قطعاً یقین نہ رہا چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی نہ صرف کانگریس میں شامل ہونے سے روکا بلکہ ان کے سامنے دو قومی نظریہ بھی پیش کیا۔ پس اس طرح سرسید احمد خان
ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سیاسی پلیٹ فارم فراہم کر دیا۔

تقسیم بنگال: بنگال کے مشرقی حصے میں مسلمانوں کی آبادی تھی لیکن یہاں بھی ہندو تھے۔ تجارت ان کے ہاتھوں میں تھی۔ زمینوں کے مالک وہ تھے
حالت صرف ملازموں اور غلاموں کی سی تھی۔ انگریزوں نے انتظامی سہولت کے پیش نظر 1905ء میں بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم مسلمانوں کے
ہندوؤں نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی اور سارے ملک میں شور مچایا کہ تقسیم بنگال کو منسوخ کیا جائے۔ ہندو جانتے تھے کہ مسلمان مالی طور پر اور سیاسی طور طاقت
گے۔ اس طرح تقسیم بنگال اور دوسرے واقعات سے ہندوؤں کے کردار کا پتہ چلتا رہا۔ تقسیم بنگال کے وقت ہندوؤں کے اس رویے پر مسلمان حیران رہ گئے چنانچہ
اپنی سیاسی جماعت بنانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔

تحریکِ پاکستان کے سفر کی اہم کڑیاں: تحریکِ پاکستان کا سفر کافی طویل ہے اس تحریک نے بہت سی منازل طے کر کے اپنا مقصد 1947ء میں حاصل کیا اس
کڑیاں مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ مسلم لیگ کا قیام: مسلم لیگ کے قیام کا راستہ سرسید احمد خان ہموار کر گئے تھے مگر مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا باقاعدہ طور پر آغاز 1906ء میں ہوا۔ مسلم قائدین
مسلمانوں کے قومی تشخص کو اجاگر کرنے کے لیے ملک گیر پیمانے پر ایک سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا اس طرح ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے
30 دسمبر 1906ء کو ایک نمائندہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا 1913ء میں محمد علی جناح مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور ان کی کوششوں سے مسلم لیگ
حکومت خود اختیاری کو اپنے مقاصد میں شامل کر لیا اس طرح اس جماعت نے ٹھیک اکتالیس سال کی جدوجہد کے بعد پاکستان حاصل کر لیا مسلم لیگ بننے کا سب سے
فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم کو ایک پلیٹ فارم مل گیا جہاں سے وہ اپنے مطالبات اور حقوق پیش کرنے لگے اس طرح مسلمانوں میں سیاسی اور ملی بیداری پیدا ہونے لگی۔

۲۔ میثاق لکھنو: 1916ء میں انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا جو لکھنو پیکٹ (میثاق لکھنو) کے نام سے مشہور ہے۔ میثاق لکھنو
اجلاس میں دونوں جماعتوں نے ہندو مسلم مصالحت کی راہ نکال لی۔ اس طرح ہندوؤں نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کو تسلیم کیا۔ جداگانہ انتخاب
طے ہونے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی جھگڑا نہ رہا اور ان کا ایک متحدہ محاذ بن گیا۔ میثاقِ لکھنو نے تحریکِ پاکستان میں جان ڈال دی کیونکہ اس میثاق کے بعد
میں ہندو مسلم اتحاد کی ایک خوشگوار فضا پیدا ہو گئی تھی۔

۳۔ تحریکِ خلافت: 1919ء میں جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد جب اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنایا تو خلافت اور ترکی کی حمایت
میں ایک زبردست تحریک شروع ہوئی جسے تاریخ میں "تحریکِ خلافت" کہتے ہیں اس تحریک نے تحریکِ پاکستان کو راستہ ہموار کر دیا اسی راستے پر چل کر مسلمان اپنے مقصد
میں کامیاب ہوئے۔

۴۔ دہلی تجاویز: 1922 سے 1927ء کا درمیانی عرصہ ہندو مسلم آویزشوں اور فسادات کا دور تھا۔ میثاقِ لکھنو میں ہندو مسلم اتحاد کی جو راہ متعین ہوئی تھی۔ وہ مسدود ہو گئی اور
دونوں قوموں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی۔ ان حالات سے متاثر ہو کر قائدِ اعظم نے 1927ء میں مسلم قائدین اور اراکین کا ایک اجلاس دہلی میں طلب کیا جس میں
دہلی تجاویز پیش کی گئیں۔ اراکین نے تمام تجاویز منظور کر لیں ان تجاویز کی منظوری کے بعد ہندوؤں کو پیش کش کی گئی کہ اگر وہ مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات بھی تسلیم کر لیں

مسلمان تحریکِ آزادی کے لئے ان کا ساتھ دیں گے ہندوؤں نے کانگریس کے ابتدائی اجلاس میں تو دہلی تجاویز تسلی کرلیں مگر بعد میں انہیں رد کر دیا گیا۔ دہلی تجاویز کا اگر چہ
کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا مگر ان سے اسلامی قومیت کی راہِ منزل متعین ہوگئی اور مسلمانوں کو اپنے علیحدہ تشخص کا پوری طرح احسان ہوگیا۔

۵۔نہرو رپورٹ: 1928ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی اس رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام حقوق کو پامال کر دیا گیا تھا نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ہندوؤں اور
مسلمانوں میں کبھی بھی اتحاد نہ ہو سکا اس رپورٹ کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان جو پہلے کئی گروہوں میں بٹے ہوئے تھے باہم متحدہ ہو گئے۔ اس طرح تحریکِ پاکستان
میں جان پڑ گئی اور وہ بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔

۶۔جناح کے چودہ نکات: 1929ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے نہرو رپورٹ کے جواب میں مسلمانوں کے مطالبات مرتب کئے جو تاریخ میں "جناح کے چودہ
نکات" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان نکات سے تصورِ پاکستان کی ابتداء ہوئی اور تحریکِ پاکستان نے ایک نئی کروٹ لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم رہنماؤں نے مسلم لیگ کی تنظیم نو
کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر دی۔

۷۔خطبہ الٰہ آباد 1930ء: جناح کے چودہ نکات کے پیش ہو جانے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان میں ایسے رہنما موجود ہیں جو ہندوؤں کے شر انگیز
رویے کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ چنانچہ 1930ء میں الٰہ آباد کے مقام پر علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنا صدارتی خطبہ پیش کیا اس خطبہ میں
انہوں نے برصغیر میں ایک علیحدہ مسلم مملکت کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز سے ہندوؤں اور انگریزوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا وہ سمجھ گئے کہ مسلمان ہر صورت میں علیحدہ ریاست
بنوا کر دم لیں گے۔ اس خطبہ نے تحریک پاکستان میں ایک نئی روح پھونک دی اور ہندوستان کے تمام مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ 1930ء سے 1937ء تک
تحریک پاکستان پورے برصغیر میں پھیل چکی تھی اور یہ اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنا بھی اس کے لئے آسان ہو گیا تھا۔

۸۔قراردادِ پاکستان: 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس ہوا اس اجلاس کی صدارت قائدِ اعظم نے کی۔ قراردادِ پاکستان میں کہا گیا تھا کہ
گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ موجودہ صورت میں مسلمانوں کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ جن علاقوں میں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی
اکثریت ہے ان کو آپس میں ملا کر مسلمانوں کی آزاد ریاست بنا دیا جائے۔ اس قرارداد کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔ اس طرح تحریکِ پاکستان اپنے مقصد سے قریب تر ہو
گئی۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری نے ہندوستان میں برطانوی راج اور ہندوؤں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور اس قرارداد نے مطالبہء پاکستان کو حقیقت کا روپ دیا۔

قیامِ پاکستان میں مسلم لیگ کا کردار

مسلم لیگ کا قیام: کانگریس کے قیام، تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کے پر تشدد مظاہروں اور شملہ وفد کی کامیابی کے بعد مسلم قائدین نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے
ایک سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت شدت سے محسوس کرنا شروع کی تا کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے اور شملہ وفد کے مطالبات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے، چنانچہ محمڈن
ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے خاتمے پر 30 دسمبر 1906 کو ڈھاکہ میں واب وقار الملک کی زیرِ صدارت ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا
گیا۔

جداگانہ انتخاب: شملہ وفد کا حکومت سے اہم ترین مطالبہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب تھا۔ مسلم لیگ نے اس مطالبے کو منوانے کے لئے گراں قدر
خدمات انجام دیں۔ برصغیر میں اس بات کو ابتداء میں ہی تسلیم کر لیا گیا تھا کہ برطانوی رائے عامہ کو ہموار کئے بغیر مسلمان اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس نظریے
کے تحت 6 مئی 1908ء کو لندن میں سید امیر علی کی زیرِ صدارت ایک اجلاس ہوا اور مسلم لیگ لندن برانچ کا قیام عمل میان لایا گیا۔ سید امیر علی نے لندن برانچ کے صدر کی
حیثیت سے انتہائی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے ویز ہند جان مارلے کو قائل کیا کہ مسلم تشخص کی بقاء کے لئے جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج کرنا ضروری ہے۔ سید
امیر علی کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ منٹو مارلے اصلاحات 1909ء میں مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کر لیا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں: 1910ء کے بعد کچھ ایسے واقعات مثلاً تقسیمِ بنگال کی تنسیخ، سانحہ مسجد کانپور، علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں رکاوٹیں اور جنگ طرابلس و بلقان
وغیرہ ہوئے جنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انگریز مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر کے حقوق کی جنگ لڑی جائے۔
محمد علی جناح اس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے رکن تھے آپ ہندو مسلم اتحاد کے سفیر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان
میثاق لکھنو 1916ء ہوا اس میں کانگریس نے منتخب اداروں میں مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی کا حق تسلیم کیا۔

1920ء کے عشرے میں کئی اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے ان میں رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن، جلیانوالہ باغ کا سانحہ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون قابل ذکر ہیں۔ تحریک خلافت میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا۔ لیکن تحریک خلافت میں گاندھی جی کے منافقانہ کردار اور نہرو رپورٹ 1982ء کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی راہیں جدا جدا ہوگئیں۔ نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام تحفظات کو نظر انداز کیا گیا جو انہیں میثاق لکھنؤ میں دیئے گئے تھے۔ نہرو رپورٹ کے ردعمل کے طور پر قائداعظم نے چودہ نکات پیش کئے۔ نہرو رپورٹ کی سفارشات اور قائداعظم کے چودہ نکات کا موازنہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی خلیج کافی وسیع ہوگئی تھی۔

مسلم ریاست کا تصور: علامہ اقبال نے 29 دسمبر 1930ء کو مسلم لیگ کے 21 دیں سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کے موقع پر اپنے صدارتی خطبے میں ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے مسلم ریاست کی علاقائی حدود متعین کرتے ہوئے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منتظم مسلم ریاست قائم کرنی پڑے گی۔" علامہ اقبال کا پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کے سماجی اور معاشی مسائل کا حل اسلامی قوانین پر عمل کرنے میں ہے لیکن متحدہ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کی وجہ سے ان قوانین کا نفاذ ممکن نہیں تھا۔ اس لئے ایک علیحدہ مسلم ریاست کا قیام ناگزیر تھا۔ اس یقین کا اظہار ان کے کئی خطوط میں بھی ہوتا ہے جو انہوں نے 1936ء اور 1937ء کے دوران قائداعظم کو لکھے۔

جدوجہد پاکستان: صوبائی انتخابات 1937ء کے نتیجے میں کانگریس نے 11 میں سے 7 صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں۔ کانگریس نے اپنی عددی اکثریت کے گھمنڈ میں کسی بھی صوبائی وزارت میں مسلم لیگ کو شامل نہ کیا اور مسلم دشمنی پر مبنی متعدد اقدامات کئے۔ بندے ماترم جیسے تعصب سے لبریز ہندو گیت کو قومی ترانہ قرار دیا، اردو کو نظر انداز کرکے ہندی کی سرپرستی کی، واردھا اور ودیا مندر کی تعلیمی اسکیموں کے تحت مسلمانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کی ناپاک سازش کی گئی، کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو ہندوستان کا قومی پرچم بنایا گیا۔ غرض یہ کہ مسلم تشخص کو ختم کرنے کے لئے جتنی صورتیں ہوسکتی تھیں وہ اختیار کی گئیں۔ کانگریس کے اس متعصبانہ رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ بحیثیت قوم ان کا متحدہ ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلم رائے عامہ علیحدہ وطن کے حصول کے لئے تیار ہوئی۔

ستمبر 1939ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور مسلم لیگ کو کانگریس کے برابر درجہ مل گیا۔ کانگریس جنگی حکمت عملی پر اختلاف کرتے ہوئے اکتوبر 1939ء میں صوبائی وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم لیگ نے کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ پر 22 دسمبر 1939ء کو یوم نجات منایا اور برطانوی حکومت کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

مارچ 1941ء میں مسلم لیگ نے اپنے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں دو قومی نظریئے کی بنیاد پر تقسیم ہند کی قرارداد منظور کی یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا دوسری عالمی جنگ کی لپیٹ میں تھی۔ حکومت برطانیہ کی خواہش تھی کہ ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں سے سمجھوتہ کرکے ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ وسائل کو جنگی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے مارچ 1942ء میں کرپس مشن کو ہندوستان بھیجا۔ لیکن ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس نے سمجھوتے کے سلسلے میں کرپس مشن کی جویز کو بالکل رد کر دیا۔

اگست 1942ء میں کانگریس نے انگریزوں کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک شروع کی۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں "تقسیم کرو اور چھوڑ دو" کا نعرہ لگایا۔ اس کے مطلب یہ تھا کہ مسلمان صرف برطانیہ سے ہی آزادی نہیں چاہتے بلکہ ہندو اکثریت کے تسلط سے بھی نجات چاہتے ہیں۔

قائداعظم کے مطالبے پر 1935ء کے ایکٹ کے تحت 46-1945ء میں عام انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے پاکستان کے نام پر انتخابات میں حصہ لیا۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی کل 30 نشتیں تھیں۔ مسلم لیگ نے نشست پر کامیابی حاصل کی۔ اس کے مقابلے میں کانگریسی مسلمانوں کو ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے 86.6 فیصد مسلم نشستیں حاصل کیں۔ مسلم لیگ کی شاندار کامیابی نے یہ ثابت کردیا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے اور مسلمانوں کی منزل پاکستان ہے۔ اس کے لئے برطانوی حکومت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مستقبل کا لائحہ عمل لیگ کی رضامندی کے بغیر مرتب کرتی۔

کیبنٹ مشن کی ناکامی کے بعد 16 اگست 1946ء کو مسلم لیگ نے "یوم راست اقدام" منایا۔ اس دن مسلمانوں نے ملک بھر میں جلسے منعقد کئے اور جلوس نکالے۔ وائسرائے اور کانگریس کے ہتھکنڈوں کے خلاف احتجاج کیا۔ یہ دن پورے ملک میں امن کے ساتھ گزر گیا۔ لیکن کلکتہ میں شدید فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان فسادات کا واحد حل ملک کی تقسیم تھا۔ چنانچہ 3 جون منصوبہ اور قانون آزادی ہند کے تحت ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کا اعلان ہوا اور 14 اگست 1947ء کو پاکستان ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ تحریک پاکستان میں مسلم لیگ نے جو کردار ادا کیا ہے وہ کوئی

دوسری سیاسی جماعت ادا نہیں کر سکی۔

تحریک پاکستان میں صوبوں کا کردار

تحریک پاکستان میں سندھ کے کردار: سندھ میں مسلمان تحریک پاکستان کے لئے روح رواں کا مرتبہ رکھتے ہیں جب 1906ء میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے
اپنی سیاسی جماعت "مسلم لیگ" قائم کی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کے پیغام پر لبیک کہا اور مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس 30 دسمبر 1907ء کو سندھ کے مشہور شہر کراچی میں
منعقد ہوا۔ اور 1917ء میں مسلم لیگ کی باقاعدہ صوبائی شاخ بھی سندھ میں قائم ہوگئی مسلم لیگ کی اس باقاعدہ شاخ کے قیام میں سندھ کے ممتاز اور پرخلوص رہنما غلام محمد بھر
گڑی کا ہاتھ تھا۔

سندھ کے سیاسی رہنماؤں اور عوام نے مسلمانوں کی ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیا جب 1920ء میں ترکوں کی حمایت شروع ہوئی تو سندھ کے عوام نے نہ صرف اس میں
حصہ لیا بلکہ اسے کامیاب بنانے دامے درمے اور سخنے کے انداز میں اس کی مدد کی اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی سندھ کے مشہور شہروں میں منعقد کرائے جب میں کراچی
اور لاڑکانہ کے اجلاس بہت مشہور ہیں۔ ان جلسوں کے انعقاد میں غلام محمد بھرگڑی اور حاجی عبداللہ ہارون کا بہت بڑا حصہ ہے جب 1921ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت
اور صدارت میں آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا تو اس میں سندھ کے زعماء نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور ان میں سے علی برادران کے ساتھ پیر غلام مجدد سندھی
بھی گرفتار ہوئے اور جیل کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔

سندھ میں تحریک خلافت کو کامیاب بنانے میں حاجی عبداللہ ہارون اور عبدالمجید سندھی پیش پیش تھے۔ اس حضرات نے تحریک خلافت کو پھیلانے اور اس میں جان ڈالنے
کے لئے ایک اخبار "الوحید" جاری کیا اور سندھ میں کچھ نام نہاد پیروں اور زمینداروں نے تحریک خلافت کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی ان کا مقابلہ کیا۔ اس
موقع پر انگریزوں نے سندھ کے مسلمانوں کو ڈرانے اور دھمکانے کی پوری کوشش کی مگر سندھ کے سپوتوں نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اسلام کے یہ شیدائی اپنے مقاصد کے حصول
کے لئے ہر مشکل برداشت کرتے رہے۔

اکتوبر 1930ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس میں ایک قرارداد میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں مسلم حکومت قائم
کردی جائے تاکہ دونوں قومیں الگ الگ حکومتیں بنا سکیں۔

1938ء میں کراچی میں سندھ مسلم لیگ کا جلاس ہوا۔ اس اجلاس میں سندھ مسلم لیگ کے ارکان نے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا اور اعلان کیا گیا کہ مسلم ہندوستان اور غیر
مسلم ہندوستان کی تقسیم کردی جائے، ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس حل کو پسند کیا اور سندھ اسمبلی نے اس فیصلہ کو تمام مسلمانوں کا فیصلہ قرار دیا۔ اسی سال جب سندھ
میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔

1940ء میں قرارداد پاکستان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں منظور ہوئی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کی پرزور حمایت و تائید کی۔ اس قرارداد کی منظوری سے ہندوؤں
اور انگریزوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے ہندوؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کردئے اس موقع پر سندھ کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی مکاریوں کا نہایت جرات
مندی سے مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے ٹکر لی۔ اور قوم کی رہنمائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھا۔

قیام پاکستان (جدوجہد آزادی) میں صوبہ پنجاب کا کردار: پنجاب آبادی اور وسائل کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا مگر انگریزوں اور ہندوؤں کی شازش کی وجہ سے یہاں
کے مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ اس صوبہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ڈاکٹر اقبال مولانا ظفر علی خان، مولانا مرتضیٰ احمد، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید
سالک نے بہت کام کیا۔ عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنے اشعار و افکار سے برصغیر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ مولانا ظفر علی خان نے 1912ء میں زمیندار اخبار جاری کیا
جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بالعموں اور پنجاب کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک عظیم ترجمان تھا۔ اس اخبار کے ذریعے مولانا ظفر علی خان نے پنجاب کے
مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کر کے انہیں مسلم لیگ کا ہم نوا بنا دیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے مخالفین پر تابڑ توڑ حملے کئے اور اس طرح پنجاب میں
تحریک پاکستان کا راستہ ہموار کردیا۔ 1934ء میں لاہور سے روزنامہ "احسان" جاری ہوا۔ اس روزنامہ کے مدیر اعلیٰ مولانا مرتضیٰ احمد تھے۔ انہوں نے اس روزنامہ کو
مسلمانوں میں سیاسی بیداری کرنے کے لئے وقف کردیا تھا۔ وہ قدم قدم پر مسلمانوں کی تائید و حمایت کرتے رہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالحمید سالک نے پنجاب
کے مسلمانوں میں سیاسی روح پھونک دی انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں جہاد کا ایسا جذبہ پیدا کردیا کہ پنجاب میں مسلمان انگریزوں اور

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

تحریک پاکستان میں صوبوں کا کردار

تحریک پاکستان میں سندھ کے کردار: سندھ میں مسلمان تحریک پاکستان کے لئے روح رواں کا مرتبہ رکھتے ہیں جب 1906ء میں متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک سیاسی جماعت "مسلم لیگ" قائم کی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کے پیغام پر لبیک کہا اور مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس 30 دسمبر 1907ء کو سندھ کے مشہور شہر کراچی میں منعقد ہوا اور 1917ء میں مسلم لیگ کی باقاعدہ صوبائی شاخ بھی سندھ میں قائم ہوئی مسلم لیگ کی اس باقاعدہ شاخ کے قیام میں سندھ کے ممتاز اور پرخلوص رہنما غلام محمد بھرگڑی کا بڑا ہاتھ تھا۔

سندھ کے سیاسی رہنماؤں اور عوام نے مسلمانوں کی ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیا جب 1920ء میں ترکوں کی حمایت شروع ہوئی تو سندھ کے عوام نے نہ صرف اس میں حصہ لیا بلکہ اسے کامیاب بنانے والے ورے اور چندے کے اندازمیں اس کی مدد کی اور خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی سندھ کے مشہور شہروں میں منعقد کرائے جب میں کراچی اور لاڑکانہ کے اجلاس بہت مشہور ہیں۔ ان جلسوں کے انعقاد میں غلام محمد بھرگڑی اور حاجی عبداللہ ہارون کا بہت بڑا حصہ ہے جب 1921ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت وصدارت میں آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا تو اس میں سندھ کے زعماء نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور ان میں سے علی برادران کے ساتھ پیر غلام مجدد سندھی بھی گرفتار ہوئے اور جیل کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔

سندھ میں تحریک خلافت کو کامیاب بنانے میں حاجی عبداللہ ہارون اور عبدالمجید سندھی پیش پیش تھے۔ اس حضرات نے تحریک خلافت کو پھیلانے اور اس میں جان ڈالنے کے لئے ایک اخبار "الوحید" جاری کیا اور سندھ میں جن نام نہاد وڈیروں اور زمینداروں نے تحریک خلافت کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی ان کا مقابلہ کیا۔ اس پر انگریزوں نے سندھ کے مسلمانوں کو ڈرانے اور دھمکانے کی پوری کوشش کی مگر سندھ کے سپوتوں نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اسلام کے یہ شیدائی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر مشکل برداشت کرتے رہے۔

اکتوبر 1930ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس میں ایک قرارداد میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان میں مسلم حکومت قائم کردی جائے تاکہ دونوں قومیں الگ الگ حکومتیں بناسکیں۔

1938ء میں کراچی میں سندھ مسلم لیگ کا جلاس ہوا۔ اس اجلاس میں سندھ مسلم لیگ کے ارکان نے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا اور اعلان کیا گیا کہ مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان کی تقسیم کردی جائے، ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اس حل کو پسند کیا اور سندھ اسمبلی کے اس فیصلہ کو تمام مسلمانوں کا فیصلہ قرار دیا۔ اسی سال جب سندھ میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔

1940ء میں قرارداد پاکستان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں منظور ہوئی تو سندھ کے مسلمانوں نے اس کی پرزور حمایت وتائید کی۔ اس قرارداد کی منظوری سے ہندوؤں اور انگریزوں کے سینوں پر سانپ لوتنے لگے ہندوؤں نے اس کے خلاف مظاہرے شروع کردے اس موقع پر سندھ کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی مکاریوں کا نہایت جرات مندی سے مقابلہ کیا اور تحریک پاکستان میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے ٹکر لی۔ اور قوم کی رہنمائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھا۔

قیام پاکستان (جدوجہد آزادی) میں صوبہ پنجاب کا کردار: پنجاب آبادی اور وسائل کے لحاظ سے بہت بڑا صوبہ تھا مگر انگریزوں اور ہندوؤں کی شازش کی وجہ سے یہاں کے مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ اس صوبہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ڈاکٹر اقبال مولانا ظفر علی خان، مولانا مرتضیٰ احمد، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک نے بہت کام کیا۔ عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنے اشعار وافکار سے برصغیر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا۔ مولانا ظفر علی خان نے 1912ء میں زمیندار اخبار جاری کیا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بالعموں اور پنجاب کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک عظیم ترجمان تھا۔ اس اخبار کے ذریعے مولانا ظفر علی خان نے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرکے انہیں مسلم لیگ کا ہم نوا بنادیا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے مخالفین پر تابڑتوڑ حملے کئے اور اس طرح پنجاب میں تحریک پاکستان کا راستہ ہموار کردیا۔ 1934ء میں لاہور سے روزنامہ "احسان" جاری ہوا۔ اس روزنامہ کے مدیر اعلیٰ مولانا مرتضیٰ احمد تھے۔ انہوں نے اس روزنامہ کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری کرنے کے لئے وقف کردیا تھا۔ وہ قدم قدم پر مسلمانوں کی تائید وحمایت کرتے رہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالحمید سالک نے پنجاب کے مسلمانوں میں سیاسی روح پھونک دی انہوں نے اپنی تقریر دں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں جہاد کا ایسا جذبہ پیدا کردیا کہ پنجاب میں مسلمان انگریزوں اور

ہندوؤں کے راستے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے اور انہیں آزادی کی جدوجہد سے کوئی طاقت نہ روک سکی۔ ہمارے ان روشن ضمیر رہنماؤں اور قائدین نے تحریک آزادی کی عظیم تر جدوجہد میں پنجاب کے مسلمانوں کو پوری طرح شامل کر دیا۔ پنجاب نے آزادی کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے

جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار: بلوچستان نے قیام پاکستان کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بلوچستان کے لوگ ہمیشہ اسلام کے شیدائی رہے ہیں۔ وہ غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں انگریزوں اور ہندوؤں سے سخت نفرت تھی۔ وہ اکثر ان قوموں سے برسر پیکار رہتے تھے اس لئے وہ آزادی کے حصول میں پیش پیش رہے۔ بلوچستان نے آزادی کے حصول کے لئے جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت واضح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بلوچستان میں مسلم لیگ کا قیام: جون 1939ء میں صوبہ بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ڈاکٹر غلام نبی اور قاضی محمد عیسیٰ نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بلوچ عوام کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کر لیا۔ اس طرح بلوچستان میں حصول آزادی کے لئے راستہ ہموار ہو گیا۔

۲۔ قرارداد پاکستان کی حمایت: 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ بلوچستان کی طرف سے اس قرارداد کے اجلاس میں قاضی محمد عیسیٰ اور دوسرے عمائدین شریک ہوئے اور اس قرارداد کی مکمل حمایت کا اعلان کیا۔

۳۔ مسلمانان بلوچستان کی استدعا: اپریل 1940ء میں مسلم لیگ کے سیکرٹری نشر و اشاعت جناب ڈاکٹر غلام نبی نے ایک اعلان جاری کیا "ہم جملہ مسلمانان ہند سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس دور افتادہ اور پس ماندہ صوبے کو بھی پوری توجہ اور امداد کا مستحق سمجھیں اور اس پر توجہ دیں" اس اعلان سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ بلوچستان کے مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پوری طرح موجزن تھی۔

۴۔ شاندار جلوس: 26 جولائی 1940ء کو بلوچستان مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کے موقع پر قائدین مسلم لیگ نے کوئٹہ ریلوے اسٹیشن سے ایک شاندار جلوس نکالا اس جلوس میں ہزاروں مسلمانان بلوچستان نے شرکت کی اور آزادی کے حق میں نعرے لگائے۔

۵۔ یوم تشکر: 23 مارچ 1941ء کو بلوچستان کے عوام نے کوئٹہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں کانگریسی امیدوار کی شکست پر یوم تشکر منایا گیا جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بلوچستان کے عوام کو مطالبہ پاکستان سے گہری وابستگی تھی۔

۶۔ مطالبہ آزادی: 13 مئی 1941ء کو بلوچستان مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں بلوچستان مسلم لیگ کے صدر جناب قاضی محمد عیسیٰ نے آزادی کا مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آزادی کے حصول کے لئے اپنی کوششیں تیز کر دیں اور آزادی کو اپنے نصب العین بنا لیں۔

۷۔ مسلم لیگ کمیٹی کا قیام: 12 اپریل 1942ء کو مسلم لیگ نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا نام مسلم لیگ کمیٹی رکھا گیا۔ اس کمیٹی کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے صدر نواب محمد اسماعیل خان تھے اور بلوچستان کی طرف سے اس کمیٹی میں قاضی محمد عیسیٰ شامل تھے۔ بلوچستان کے عوام نے قاضی صاحب کی رہنمائی میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

۸۔ معمار پاکستان کو خوش آمدید: 26 جون 1943ء کو قائداعظم بلوچستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے کوئٹہ پہنچے تو اس موقع پر مسلمانوں بلوچستان نے قائداعظم کا پرجوش استقبال کیا اور کہا "ہم معمار پاکستان کو خوش آمدید کہتے ہیں" اس یادگار اجتماع میں فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ اس اجتماع میں قائداعظم نے بلوچستان کے مسلمانوں کی خدمات اور قربانیوں کو بہت سراہا۔ بلوچستان کے مسلمانوں نے اس عزم کا اعادہ کیا کہ ہم پاکستان لے کر رہیں گے۔

۹۔ جمعیت العلمائے بلوچستان کی خدمات: قیام پاکستان کے سلسلے میں بلوچستان کے علماء کرام نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اس ضمن میں علماء کی ایک جماعت قائم کی۔ جس کے ارکان قائداعظم سے سیاسی حالت پر گفتگو کے لئے ملاقات کرتے رہتے تھے۔ جمعیت العلماء نے آزادی کے لئے بلوچستان کے عوام کو تیار کیا اور قیام پاکستان کی حمایت کا اعلان پورے عزم کے ساتھ کیا۔ پس اس طرح بلوچستان کے مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کے ساتھ مسلم طلباء نے بھی بہت کام کیا طلباء نے 1943ء میں بلوچستان مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ جس نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ کا تحریک پاکستان میں کردار: شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے نوجوانوں اور بزرگوں نے حصول آزادی کی کوششوں میں زبردست حصہ لیا وہ برطانوی حکومت کے خلاف چلائی جانے والی ہر تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتے رہے۔ انگریزوں نے صوبہ سرحد کی سرزمین کو بے آئین بنا رکھا تھا اور یہاں کے مسلمانوں کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مگر صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ مسلسل انگریزوں سے برسر پیکار رہے۔ انگریزوں نے ان پر مظالم ڈھائے۔ انہیں

Lecturer Sheikh Asif Iqbal Zahoori

جیلوں میں ڈالا لیکن صد آفرین کہ انہوں نے شجاعت اور بلند حوصلگی کا دامن نہ چھوڑا۔ وہ اپنے دشمن کے پیچھے لگے رہے اور آزادی کی جدوجہد پورے طمطراق کے ساتھ جاری رکھی صوبہ سرحد کے مسلمان اس قدر نڈر تھے کہ جب اپریل 1947ء میں وائسرائے ہند نے سرحد کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو یہاں کے مسلمانوں نے وائسرائے ہند پر واضح کر دیا کہ سرحد کے مسلمان اور مسلم لیگ اپنے مقصد کے لئے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں اور وہ اس مقصد کے لئے کسی اثر کو قبول نہیں کریں گے۔

صوبہ سرحد نے آزادی کی جدوجہد میں جو کردار ادا کیا اسے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

ا۔ ہندو اور مسلم علاقوں کی تقسیم کا مطالبہ: فروری 1933ء کو سرحدی مسلمانوں کے ایک رہنما سردار محمد گل خان نے مطالبہ کیا کہ ملک کو ہندو اور مسلم علاقوں میں تقسیم کر دینا چاہئے اور پشاور سے آگرہ تک کا علاقہ مسلمانوں کر دے دیا جائے۔ اس اعلان کے ساتھ انہوں نے ایک کمیٹی بھی قائم کر دی جس کا بنیادی فرض مسلمانوں کے مطالبات اور ان کے سیاسی حل کے لئے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کمیٹی کے ارکان نے سرحدی علاقوں میں کام شروع کیا اور تمام مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کی۔

۲۔ قرارداد پاکستان کی حمایت: جب 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو سرحد کی طرف سے سردار اورنگ زیب نے اس کی موثر انداز میں تائید کے بہت سے بزرگوں نیز اردو لا ہور کے اجلاس میں شرکت بھی کی اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

۳۔ سرحد مسلم لیگ کا قیام: سرحد میں مسلم لیگ کا قیام بہت دیر میں عمل میں آیا ورنہ 1945ء تک سرحد کے مسلمان بغیر کسی مرکزی اور سیاسی جماعت کے برصغیر کے مسلمانوں کا ساتھ دے رہے تھے کہ ان کی یہ ادا نہایت قابل تعریف تھی۔ 1945ء میں قائداعظم کی کوششوں سے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ قائم کر کے اسے فعال بنایا گیا۔ مسلم لیگ کے فعال بنتے ہی سرحد کے مسلمان اس میں شامل ہو گئے اور انہوں نے علیحدہ وطن کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیا۔ کانگریسی حکومت نے مسلم لیگیوں پر مظالم توڑے۔ انہیں جھوٹے مقدمات میں ملوث کیا اور تقریباً آٹھ ہزار کارکن نظر بند کے گئے مگر مسلم لیگ کی تحریک زور شور سے جاری رہی۔ سرحد کے مسلمانوں نے ایک خفیہ قلمی روزنامہ "صدائے پاکستان" اور ایک ریڈیو اسٹیشن شروع کر دیا جن سے تحریک کو رہنمائی ملتی رہی۔ اس طرح سرحدی مسلمانوں کا کارواں تحریک پاکستان میں قابل قدر کردار ادا کرتا رہا۔

۴۔ 1945-46ء کے انتخابات میں حصہ: مسلمانان صوبہ سرحد نے 1945ء و 1946ء کے انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک پاکستان کو عروج پر پہنچا دیا اس موقع پر صوبہ سرحد میں کانگریس کی حکومت تھی۔ کانگریسی حکومت نے صوبہ سرحد کے مسلمانوں کو طرح طرح سے ہراساں کیا وہ انتخابات میں مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیں مگر اس صوبہ کے زیادہ تر مسلمانوں نے مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ دیا اور کانگریس کے مقابلے میں 17 نشستیں جیت لیں۔ اس طرح اہل سرحد نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

۵۔ تحریک سول نافرمانی کا آغاز: صوبہ سرحد میں مسلم لیگ نے تحریک سول نافرمانی کا آغاز کیا۔ مسلم لیگ کی اس تحریک کا مقصد پاکستان اسکیم کو ماننا اور مسلمانوں کی مکمل آزادی تھا اس تحریک میں ایک مسلم لیگی گرفتار ہوا۔ خان عبدالقیوم خان بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس پر صوبائی مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک میں شدت پیدا کر دی۔ صوبہ کے تمام مسلمان کانگریسی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح سرحد کے مسلمانوں نے قدم قدم پر تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔

۶۔ طلباء کا کردار: صوبہ سرحد کے طلباء نے تحریک آزادی میں موثر کردار ادا کیا۔ انہوں نے پورے صوبہ میں جوش و خروش پیدا کر دیا۔ اسلامیہ کالج پشاور اور ایڈورڈ کالج پشاور کے طلباء میدان عمل میں نکل آئے اور اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھے جب تک ان کا مقصد "قیام پاکستان" پورا نہ ہوا۔

سرحد کے علماء اور مشائخ کا کردار: سرحد کے علماء اور مشائخ نے بھی تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں پاکستان کے تصور کو ابھارا۔ پیر صاحب مانکی شریف اور دوسرے مشائخ نے بھی پاکستان میں شرکت کی اور سے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔
تحریک پاکستان کے سلسلے میں سرحد کے غیور مسلمانوں نے بیش بہا قربانیاں دیں اور تحریک پاکستان کے لئے لڑے جانے والے ہر محاذ پر ہراول دستہ کا کام دیا۔

(☆)

قیام پاکستان کے اغراض ومقاصد

قیامِ پاکستان: قیامِ پاکستان مسلمانانِ ہند کی بے شمار قربانیوں اور مسلسل جدوجہد کا ثمرہ ہے یہ وہ سلطنت خداداد ہے جس کا مطالبہ اسلامی نظریہ حیات کو بنیاد بنا کر کیا گیا تھا

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

تاکہ مسلمان اسلام کے درس آزادی اور مساوات کی روشنی میں اپنی زندگی گزار سکیں۔ اور جہاں اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں کا دور دورہ ہو سکے۔ قیام پاکستان کا مقصد محض ایک ملک بنا کر اس پر حکومت کا کام کرنا مقصود نہیں تھا کیونکہ دنیا میں مسلمانوں کی حکومتیں پہلے سے بھی قائم تھیں بلکہ اس کا مقصد اسلامی اصولوں کی اشاعت اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ کا قیام تھا۔ ایک ایسے معاشرے کے قیام جہاں تمام افراد کی نظروں میں برابر ہوں اور ان کے حقوق و فرائض میں توازن ہو۔ قیام پاکستان کا مقصد ایک آزاد خود مختار ریاست قائم کرنا تھا جہاں مسلمان قرآن و سنت کے مطابق زندگی گزار سکیں قیام پاکستان کے مقصد کو محمد علی جناح نے یوں بیان فرمایا۔ "ہم نے پاکستان کا مطالبہ زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا ہمارا مقصود تھا جہاں ہم اسلامی کے اصولوں کو اپنا سکیں"

قیام پاکستان کا مقصد مسلمانوں کو قرآن کے ضابطہ اخلاق میں ڈھالنا تھا کیونکہ اس ضابطہ اخلاق میں مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج اور روزمرہ کی زندگی کے قوانین موجود ہیں جن پر عمل کر کے روح کی پاکیزگی اور بدن کی صفائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ قیام پاکستان کا مقصد صرف آزادی اور خود مختاری نہیں بلکہ اس کا مقصد اسلامی نظریئے کا تحفظ اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرتی عدل اور قانونی مساوات کے اصولوں کی ترجمانی کرنا تھا۔ قیام پاکستان کے مقاصد یہ ہیں۔ قیام پاکستان کا مقصد اسلامی نظریہ حیات کا تحفظ تھا مسلمان چاہتے تھے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے جہاں زندگی قرآن وسنت کے مطابق گزاری جاسکے، جہاں احکام الٰہی کے مطابق حکومت قائم کی جاسکے اور جہاں تمام فلسفوں کو چھوڑ کر کلمہ طیبہ کو ایک علیحدہ وطن کا تاج بنایا جاسکے۔ پاکستان کو قائم کرنے کا مقصد ملک میں ایسی جمہوریت کا قیام تھا جو مسلمانوں کو ان کے محسن اعظم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے عطا کی تھی اسلامی جمہوریت میں شریعت کی بالادستی ہوتی ہے اور اس میں حکمران صرف ایک نائب کی حیثیت سے کام کرتا ہے اسلامی جمہوریت میں حکومت اور عوام برابر کی شریک ہوتے ہیں قائداعظم پاکستان میں اسی قسم کی جمہوریت کے قائل تھے اور یہی پاکستان کا اصل مقصد تھا۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کو مٹانے کا فیصلہ کر رکھا تھا انہوں نے مسلمانوں کو ختم کرنے اور ان کی تہذیب کو مٹانے کیلئے بڑے بڑے گھناؤنے حربے استعمال کئے مسلمانوں پر مظالم توڑے اور انہیں اقلیت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا ان حالات میں مسلمانوں میں ایک ایسے علیحدہ وطن کے قیام کا جذبہ پیدا کر دیا جہاں وہ آزادانہ طور اپنے تمدن اور ثقافت کی حفاظت کر سکیں۔

﴿☆﴾

بابائے قوم قائداعظم (1876ء-1948ء)

محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور کراچی میں ہی میں 11 ستمبر 1948ء کو وفات پائی۔ ان کے والد کھوجہ خاندان کے ایک تاجر تھے جن کا نام جناح پونجا تھا جو مستقبل کے سیاسی قائد کے باپ تھے۔ جناح بچپن ہی سے اونچے قد کے دبلے پتلے انسان تھے جناح کے معنی گجراتی زبان میں طویل القامت یا دبلے شخص ہوتے ہیں محمد علی جناح کو یہ خاندانی نام ورثہ میں ملا۔

انہوں نے ابتدائی سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی سے حاصل کی اور بعد میں کرسچن مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ والہ سال کی عمر میں وہ لندن کے لئے بحری سفر پر روانہ ہوئے تاکہ قانون کی تعلیم حاصل کریں۔ لندن میں انہوں نے لنکنز ان میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے بار ایٹ لاء کا امتحان 1896ء میں امتیازی نشانات سے پاس کیا۔ ہندوستان واپس آئے اور اسی سال کراچی میں وکالت شروع کر دی۔ ایک سال بعد اپنی لیاقت کے مطابق اپنے کاروبار کو وسعت دینے کی غرض سے وہ بمبئی تشریف لے گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں بمبئی بار کونسل کے اعلیٰ رکن بن گئے۔

1905ء میں قائداعظم نے انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت حاصل کر لی۔ 1910ء میں وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے ان کا مسلم حلقہ انتخاب بمبئی پریسیڈنسی تھا اپنی ساری پارلیمانی زندگی کے دوران جو تقریباً چار دہائیوں پر مشتمل تھی وہ ہندوستانیوں کے حقوق اور آزادی کے لئے ایک طاقتور آواز ثابت ہوئے۔

1913ء میں جناح مسلم لیگ کے رکن بنے ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہندو مسلم اتحاد کو یقینی بنانا تھا تاکہ دونوں اقوام مل کر اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر سکیں اور اس مقصد کے لئے وہ ہندو مسلم اتحاد کے معمار بن گئے۔ 1916ء کا ہندو مسلم معاہدہ ان ہی کا مرہون منت تھا جو بعد میں میثاق لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوا۔ جو واحد معاہدہ تھا جو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان طے پا سکا تھا۔

اگرچہ جناح بعد میں کانگریس سے علیحدہ ہو گئے لیکن پھر بھی ہندو مسلم اتحاد کے قیام کے لئے کوشش کرتے رہے۔

صوبوں میں کانگریسی وزارتیں: جولائی 1937ء میں کانگریس گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں ہندوستان کی بالادست سیاسی جماعت کی حیثیت سے برسر اقتدار آئی۔ اسی سال جناح کی ولولہ انگیز قیادت میں مسلم لیگ کی تنظیم نو عمل میں آئی اور یہ ایک عوامی ادارہ بن گئی اور مسلمانوں کی ایسی نمائندہ جماعت بنی جس کا پہلے وجود نہ تھا

۔اس کے علاوہ اس تاریخی سال میں ہندوستانی سیاست میں نئے نئے رجحانات نے جنم لیا جو بعد میں آنے والے برسوں میں مرتکز ہو کر برصغیر کی تقسیم کا باعث بن گئے۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی کہ مسلمانوں کے پاس جناح جیسے معیاری قائد موجود تھے جو جدوجہد پاکستان میں مصروف تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ان کی باطنی تمناؤں کے مطابق ہوتا ہے اور ایسا جب ان کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے لیکن اگر وہ موزوں اہلیت کا کوئی قائد پیدا نہ کر سکیں جو نازک اوقات میں انہیں دستیاب ہو تو ان کی تمنائیں اور تقاضے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے ارادے زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوتے۔ جناح کے بغیر بھی پاکستان بن سکتا تھا لیکن اس میں بہت تاخیر ہو جاتی اور مزید آئی دہائیوں تک انتظار کرنا پڑتا اور اس کی راہ میں کئی اختلافات اور دشواریوں کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے یہ وہی عظیم لیڈر تھے۔ جنہوں نے ہر قدم پر اپنے عوام کو سیدھا راستہ دکھایا اور کئی مشکلات سے بچایا یہ ان کی شخصی لگن تھی جو انہوں نے اپنے عوام کی آزادی کے لئے مختص کر دی تھی اور جس سے کام لے کر انہوں نے صرف سات سال کے عرصہ میں قوم کو فتح اور کامرانی سے ہمکنار کر دیا۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی مسائل اور مشکلات

ابتدائی حالات: قیام پاکستان کے بعد حکومت کو بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک نوزائیدہ ریاست کے مسائل سے حکومت کا عہدہ برا ہونا خاصہ مشکل کام تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی عنایت اور قائداعظم کی فراست کی بنا پر پاکستان ان مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان میں سے چند مسائل مندرجہ ذیل ہیں۔

انتظامی مسائل: پاکستان کو ابتدائی دور میں بے حد سنگین اور پر خطر انتظامی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ نظم و نسق کے اعتبار سے عہد انگریز کا انتظامی ڈھانچہ ایک دفعہ بالکل منتشر ہو چکا تھا۔ انتظامیہ اک وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر انگریزوں کے چلے جانے سے دفتروں میں مسلمان اپنی نا اہلیت کی وجہ سے ان کی کمی پوری نہ کر سکے چنانچہ حکومت کو مجبوراً انگریزوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں اور تین صوبوں میں انگریز افسران مقرر کئے گئے۔ مرکزی حکومت کے پانچ سیکریٹری بھی انگریز تھے۔ انتظامی امور کیلئے عمارتیں بھی نہ تھیں اور انتظامات کیلئے حکومت کے پاس اثاثے نہ تھے۔ پھر حکومت نے سب سے پہلے ایک مرکزی حکومت کا ڈھانچہ تشکیل دیا۔ بہر حال اس چیلنج کو جواں عزم قوم نے قبول کیا اور بہت جلد بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پالیا۔

مہاجرین کا مسئلہ: مہاجرین کی آبادی کا مسئلہ بہت نازک اور اہم تھا۔ دراصل ہندوستانی حکومت نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوستان سے لاکھوں مہاجرین کو پاکستان میں دھکیل دیا۔ تاکہ پاکستان کا انتظامی ابتداء ہی سے مفلوج ہو جائے قائداعظم نے اپنا ہیڈ کوارٹر لاہور منتقل کیا تاکہ مہاجرین کی مسلسل آمد پر اپنی ذاتی توجہ دے سکیں۔ مہاجر کیمپوں میں 1948ء تک تقریباً سوا کروڑ مہاجرین پہنچے اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ قائداعظم نے ان حالات پر دوراندیشی، ثابت قدمی اور غیر معمولی ذہانت سے قابو پالینے کی کوشش کی۔ مقامی لوگوں نے دل کھول کر اپنے اثاثوں سے مہاجرین کی مدد کی اور اس طرح انصار کا کردار ادا کیا۔ حکومت نے اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے محکمہ بحالیات قائم کیا جس نے غیر مسلموں کو متروکہ جائیداد مہاجرین میں تقسیم کی۔ اس طرح حکومت اور عوام کے باہمی تعاون سے مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ حل ہو گیا۔

اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ: تقسیم ہند کے وقت یہ طے پایا تھا کہ برطانوی ہند کے اثاثوں کی تقسیم بھی پاکستان اور بھارت کے مابین ہو گی مگر کانگریس کی چالاکیوں کے باعث پاکستان کو بہت کم سامان ملا۔ متحدہ ہندوستان کا چار ارب روپے کا سرمایہ بھی محفوظ نہ تھا جس میں معاہدہ کے مطابق ایک روپیہ ملنا چاہئے تھا مگر افسوس ہندوؤں کے متعصبانہ رویے نے یہاں بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچایا اور اتنی بڑی رقم میں سے صرف بیس کروڑ روپے پاکستان کو دیئے۔ اس کے علاوہ متحدہ ہندوستان کے قرضوں کا بیس فیصد حصہ بھی پاکستان کے ذمہ ڈال دیا گیا۔ بہر حال پاکستان نے اثاثوں کی غلط تقسیم پر بھی حوصلہ نہ ہارا۔

فوج اور فوجی اثاثوں کا مسئلہ: تقسیم ہند کے بعد اپنے تحفظ اور ملکی دفاع کیلئے پاکستان کو فوجی اور قومی ساز و سامان کی اشد ضرورت تھی۔ انگریز کمانڈر انچیف افواج کی تقسیم کے خلاف تھا مگر قائد نے دلیل دی کہ ایک ملک کو اپنی خود مختاری کیلئے فوج کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ افواج کی تقسیم کیلئے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی گئی کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق ایک تہائی فوجی اثاثہ پاکستان کو ملنا چاہئے تھا لیکن اسلحہ بنانے کے تمام کارخانے اور فوجی سامان کے ڈپو ہندوستان کے علاقوں میں تھے اس لئے ہندوستان کی حکومت نے فوجی ساز و سامان دینے اور اسلحہ بنانے والے کارخانوں کو منتقل کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح پاکستان فوجی اثاثوں سے بھی محروم ہو گیا لیکن جلد ہی اس مشکل پر بھی قابو پالیا گیا۔

نہری پانی کا مسئلہ: پاکستان کو ابتدا ہی میں کمزور بنانے کیلئے مختلف مسائل سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پیدا کئے جا رہے تھے ان میں ایک نہری پانی کا مسئلہ بھی تھا صوبہ

پنجاب کی غیر منصفانہ تقسیم کے باعث نہری پانی کا جھگڑا پیدا ہوا۔ پنجاب کے دو علاقے مادھو پور اور فیروز پور ہیڈ ورکس ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے جن سے نہریں آکر پنجاب کے بیشتر علاقوں کو سیراب کرتی تھیں چنانچہ ہندوستان نے پاکستان کو اقتصادی بحران میں مبتلا کرنے کیلئے نہروں کا پانی بند کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ بھارت نے راوی، بیاس اور ستلج پر ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ بھارت کا یہ دعویٰ بین الاقوامی قانون کے خلاف تھا۔ چنانچہ پاکستان نے عالمی عدالت سے رجوع کیا 1961ء میں یہ معاہدہ ہوا کہ دریائے ستلج، بیاس اور راوی کے استعمال کا حق بھارت کو حاصل ہوگا۔ اور دریائے جہلم، چناب اور سندھ پر پاکستان کا حق ہوگا۔ اس طرح کافی حد تک نہری پانی کا مسئلہ حل ہو گیا۔

معاشی مسائل: مہاجرین اپنے تمام اثاثے ہندوستان چھوڑ آئے تھے ان کی تمام جائیدادیں ہندوستان میں رہ گئیں تھیں۔ مہاجرین کی آمد سے قبل ہندو یہاں کی تجارت پر راج کرتے تھے انہوں نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے اپنے تمام اثاثے ہندوستان منتقل کر دیئے جس سے پاکستانی معیشت کو سخت نقصان پہنچا۔ بینک بند ہو گئے تجارت معطل ہوگئی بے روزگاری میں اضافہ ہوگیا اور پاکستان معاشی بحران کا شکار ہوگیا۔ لیکن پاکستانی عوام نے معاشی مسائل کا مقابلہ بلند ہمتی سے کیا اور چند ہی برس میں پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔

معاشرتی و اخلاقی مسائل: بھارت سے جبری انتقال آبادی اور فرقہ وارانہ فسادات سے پاکستان کا معاشرتی ڈھانچہ بھی بری طرح متاثر ہوا۔ ملک میں ہر سمت دہشت، بدنظمی اور افراتفری کا دور دورہ ہوگیا۔ مہاجرین کی آمد اور بے سروسامانی نے بے شمار مشکل پیدا کر دی۔ لوگوں کو اپنوں سے بچھڑ کر نئے ماحول میں آباد ہونا پڑا اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کا احترام نہ رہا۔ باہمی میل جول کا قدیم اسلامی اصول درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ آبادی کی اس اکھاڑ پچھاڑ نے نہ صرف معاشرتی بلکہ لاتعداد اخلاقی برائیوں کو جنم دیا۔ غربت کے باعث ڈاکہ زنی، لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ عام ہوگئی۔

دستوری مسائل: نوزائیدہ حکومت کیلئے سب سے اہم مسئلہ دستور کی تشکیل تھی جو کہ آئندہ ہونے والے تمام امور کا بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے چنانچہ پہلے انتخابات کے بعد دستور ساز اسمبلی بنائی گئی۔ دستور میں کئی مشکلات تھیں مثلاً پاکستان کے دونوں حصوں کی نمائندگی کا سوال، طریق انتخاب اور زبان کا مسئلہ۔ پاکستان کیونکہ ایک نظریاتی ملک ہے چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم ہوگا۔

ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ: قیامِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ ریاستوں کا الحاق تھا کیونکہ قانون آزادی ہند کے تحت برطانیہ نے والیانِ ریاست کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ جس حکومت کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں چنانچہ بھاولپور، لسبیلہ، مکران اور قلات کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہوگئیں لیکن منگرول اور جوناگڑھ نے پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا تو بھارت نے ان پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ 1948ء تک قائداعظم زندہ رہنے کے سبب بھارت "نابھا" اور "کشمیر" پر قبضہ نہ کر سکا مگر بعد میں دونوں ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح یہ مسئلہ اب تک بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے حل نہ ہو سکا۔

قراردادِ مقاصد 1949ء

قراردادِ مقاصد 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کے پہلے وزیراعظم نواب لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں پیش کی۔ پاکستان کی آئین سازی میں قراردادِ مقاصد بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے چند اہم نکات ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔

نکات:

- اللہ تعالیٰ بلا شرکت غیرے اس کائنات پر اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے مطابق پاکستان کے عوام حکومت کے امور انجام دیں گے۔
- جمہوریت، آزادی، مساوات اور معاشرتی انصاف کے وہ تصورات جو اسلام نے پیش کئے ہیں ملک میں نافذ کئے جائیں گے۔
- ملک میں وفاقی نظام حکومت قائم ہوگا اور صوبوں کو آئینی حدود کے اندر خودمختاری حاصل ہوگی۔
- ملک میں رہنے والوں کے بنیادی حقوق کی پوری ضمانت دی جائیگی۔
- ملک میں آزاد عدلیہ قائم ہوگی تاکہ عوام کو انصاف مہیا ہو سکے۔
- ریاست اپنے اقتدار کو منتخب نمائندوں کے ذریعے چلائی گی۔

1956 کا آئین

	1965 سے قبل	1965 کے بعد
وفاقی فہرست	59	30
مشترکہ فہرست	36	19
صوبائی فہرست	54	94

صدر کا انتخاب: صدر مملکت کے لئے عمر کی حد 40 سال مقرر کی گئی۔ اس کا مسلمان ہونا ضروری تھا اور وہ قومی اسمبلی کے رکن کے طور پر منتخب ہو سکتا ہو۔ صدر کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں اور قومی اسمبلی کے اراکین پر مشتمل انتخابی کالج کرے گا۔

بنیادی حقوق: اس آئین میں تمام جمہوری حقوق اور آزادیاں فراہم کی گئی تھیں مثلاً تحریر و تقریر کی آزادی جلسے جلوس اور تحریک چلانے کی آزادی وغیرہ۔ شہری حقوق کے حوالے سے بھی تمام عمومی حقوق جیسے زندگی کی آزادی اور جائیداد وغیرہ سے متعلق تمام حقوق کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ عدلیہ کو بنیادی حقوق کے تحفظ کا نگران بنایا گیا تھا۔ عدالت کو یہ فیصلہ کرنے کا مجاز قرار دیا گیا تھا کہ کوئی قانون بنیادی حقوق کی کسی شق کی خلاف ورزی نہ کرنے پائے۔

آزاد عدلیہ: 1956ء کے آئین کے تحت عدلیہ کو ریاست کے تمام اداروں پر بالادستی حاصل تھی ججوں کی خودمختاری کو تحفظ دینے کے لئے مناسب شقیں بنائی گئی تھیں تاکہ پاکستان میں حقیقی اور غیر آلودہ شکل میں انصاف فراہم کیا جا سکے۔

زبان: اردو اور بنگالی کو پاکستان کی قومی زبانیں قرار دیا گیا۔

1956ء کے آئین کی اسلامی شقیں:

۱۔ 1956ء کے آئین میں قرارداد مقاصد کے مسودے کو بغیر کسی بڑی تبدیلی کے شامل کیا گیا تھا۔

۲۔ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا۔

۳۔ پاکستان کے تمام شہریوں کو بیان اور عمل کی آزادی اپنے مذہب کی تبلیغ کی آزادی اور اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے اور منظم کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔

۴۔ رہنما اصولوں کے مطابق ایسے اقدامات کئے جائیں گے جس کے مطابق پاکستان کے مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگیاں قرآن و سنت کے مطابق گزار سکیں۔

۵۔ کسی ایسے قانون کا نفاذ نہیں کیا جائے گا جو قرآن و سنت کی تعلیمات کے منافی ہو اور موجودہ قوانین کو اس نوعیت پر ڈھالا جائے گا۔ قوانین کے اسلام کے مطابق ہونے کا فیصلہ قومی اسمبلی کرے گی۔

۶۔ صدر مملکت صرف مسلمان ہوگا۔

۷۔ صدر مملکت اسلامی تحقیق اور تعلیمات میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کریں گے جو حقیقی اسلامی بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر نو میں مدد دے گا۔

۸۔ مسلمانوں کے لئے قرآن کی تعلیم لازمی ہوگی۔

۹۔ غلامی اور جبری مشقت کی اجازت نہیں ہوگی۔

۱۰۔ شراب اور دیگر منشیات کی خرید و فروخت پر پابندی ہوگی نیز جسم فروشی کی ممانعت ہوگی۔

۱۱۔ کوئی شہری کسی ایسے ٹیکس کی ادائیگی کا پابند نہیں ہوگا جو اس کے مذہب کے علاوہ کسی دیگر مذہب کی تبلیغ کے لئے خرچ ہو رہا ہو۔

۱۲۔ مسلم ممالک کے درمیان اتحاد مضبوط کرنا ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔

1956ء کے آئین کے نقائص:

۱۔ اختیارات کی عدم مرکزیت جو ایک سیاسی حقیقت تھی اسے آئین میں مہیا نہیں کیا گیا تھا حالانکہ یہ ایک ریاست کی بنیاد ہوتی ہے۔

۲۔ وفاقی فہرست کو محدود کر کے صوبائی فہرست میں بڑی حد تک اضافہ کیا گیا جس کے تحت دیگر امور کے علاوہ معدنی وسائل پر کنٹرول، اندرونی مواصلات اور ملازمتوں میں بھرتی کے علاوہ صوبہ سرحد میں قبائلی علاقے کے معاملات شامل تھے۔ یہ عمل ترقی یافتہ ممالک سے مختلف تھا، جہاں ایک مضبوط مرکز ... وفاقی امور کو ایک مشترکہ قومیت کی تشکیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس لئے ایک ایسے ملک میں جو پہلے ہی جغرافیائی طور پر تقسیم ہو آئینی اتحاد کا سبب بننے کے بجائے ... علیحدہ سیاسی اکائیوں کے قیام کا باعث بنا جنہیں اپنے معاملات کار میں زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل تھی۔

۳۔ قومی اسمبلی میں نمائندگی کے سلسلے میں مساوات کا اصول متعارف کر کے علاقائی وفاداریوں کے رجحان کو تقویت پہنچائی گئی تھی۔ آئین اس یقین کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا تھا کہ ملک کی سیاسی زندگی صوبائیت کے رجحان کے باعث ہمیشہ یونہی رہے گی اور قومیت کی اس معراج تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی جہاں جماعت سے وابستگی جسمانی رکاوٹوں پر ... ہوتی ہے۔ مساوات کے اس اصول نے ملک کے اس حصے میں بھی منفی جذبات پیدا کئے جس کے فائدے کے لئے یہ اصول بنایا گیا تھا اور اس حصہ میں بھی جس کے مفادات پر اس سے ضرب پڑ رہی تھی۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

1962ء کا آئین

نمایاں خصوصیات:

تحریری آئین: یہ ایک تحریری آئین تھا۔

غیر لچکدار آئین: یہ ایک غیر لچکدار آئین تھا ایسے آئین میں صرف ایک مخصوص طریقہ کار کے ذریعہ ہی ترمیم کی جاسکتی ہے۔ اگر پارلیمان کی دو تہائی اکثریت نے آئین میں کسی قسم کی ترمیم کی تو یہ صدر مملکت کی منظوری کے بعد قانون کا حصہ بن جاتی ہے۔

اسلامی شقیں: 1962ء کے آئین میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ پوری کائنات پر اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس آئین کے مطابق صرف مسلمان ہی ریاست کا سربراہ ہو سکتا ہے۔ قرآن وسنت کی روح کے منافی کوئی قانون منظور نہیں کیا جائیگا اور موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جائیگا۔

وفاقی نظام: اس آئین میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان برابری کے اصول کو برقرار رکھتے ہوئے وفاقی نظام حکومت تجویز کیا گیا تھا۔ دونوں صوبوں کے علیحدہ صوبائی حکومتیں ہوں گی۔ آئین میں مرکز اور صوبوں کے اختیارات اور ذمہ داریاں واضح طور پر دی گئی تھیں۔

ایک ایوانی مقننہ: مرکزی مقننہ صرف ایک ایوان پر مشتمل ہوگی جسے قومی اسمبلی کہا جائے گا۔ قومی اسمبلی کے 156 اراکین ہونگے جس میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی مساوی نمائندگی ہوگی۔

صدارتی طرز حکومت: 1956 کے آئین میں دیئے ہوئے پارلیمانی طرز حکومت کی جگہ اس آئین میں صدارتی طرز حکومت تجویز کیا گیا تھا۔ صدر مملکت ہوگا۔ 35 سال سے کم عمر نہ ہوگا اور قومی اسمبلی کے رکن کے طور پر منتخب ہونے کی اہلیت رکھتا ہو۔ اس کا انتخاب آئین میں دیئے گئے طریقے کار کے مطابق انتخابی کالج کریگا۔ اس آئین میں عمر کی حد 40 سال کے بجائے 35 سال رکھی گئی تھی۔

صدر کا انتخاب: صدر کا انتخاب 80,000 بنیادی جمہوریت کے اراکین پر مشتمل انتخابی کالج کے ذمہ تھا جسے دونوں صوبوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا گیا تھا۔ 1962 کے آئین کے تحت اگر صدر کے امیدواروں کی تعداد تین سے زیادہ ہو تو پھر قومی اسمبلی کے اسپیکر قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے اراکین کا مشترکہ اجلاس بلوائیں گے جو صرف تین امیدواروں کا انتخاب کریں گے۔ یہ اسکریننگ صدر کے عہدے پر فائز شخص پر لاگو نہیں ہوتی تھی اگر موجودہ صدر بھی امیدوار ہو تو امیداروں کی تعداد چار ہوگی۔

صدر کے اختیارات: صدر کے لئے بطور سربراہ ریاست اور چیف ایگزیکٹو کام کرنے کے لئے عہدوں کی مدت پانچ سال رکھی گئی۔ اسے ملکی انتظام کے کلی اختیارات حاصل ہونگے اس گورنروں اور وزراء کے تقرر و برطرفی کا اختیار ہوگا۔ صدر کو آرڈیننس جاری کرنے اور قومی اسمبلی کے دو تہائی اراکین کے منظور کردہ قانون کے خلاف ویٹو کرنے کا اختیار ہوگا۔ بہر حال صدر کو اسمبلی تحلیل کرنے کی صورت میں خود بھی اپنے عہدے سے استعفیٰ دینا ضروری ہوگا۔

صدر کے مواخذے اور برطرفی کا اصول: آئین کی خلاف ورزی کرنے یا بد انتظامی کے الزام میں صدر کی برطرفی کے لئے قومی اسمبلی کے ایک تہائی اراکین کا اسپیکر کے نام تحریری نوٹس دینا ہوگا۔ صدر کو اس کے عہدے سے صرف اس صورت میں ہٹایا جاسکتا ہے اگر مواخذہ کی قرارداد کے حق میں قومی اسمبلی کے کل اراکین میں سے تین چوتھائی افراد ووٹ دیں۔ مواخذہ کے عمل کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اگر مواخذہ کی تحریک کے حق میں نصف اراکین سے کم ووٹ آئیں تو تحریک پیش کرنے والوں کو اپنی رکنیت چھوڑنی ہوگی۔

صدر کی حدود: صدر مملکت کسی قسم کے سرکاری عہدے پر فائز نہیں ہوسکتے تھے تاہم ذاتی جائیداد رکھنے کا حق حاصل تھا۔

اسپیکر کا عہدہ: اسپیکر کے عہدے کے لئے مذہب کی کوئی قید نہ تھی۔ اگر صدر مملکت اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں یا اس کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہو جاتا ہے تو آئین کے مطابق اسپیکر اس وقت تک عبوری صدر کے طور پر کام کریگا جب تک نیا صدر منتخب نہیں ہو جاتا لہٰذا خصوصی حالت میں ایک غیر مسلم کو قائم مقام صدر بننے کا موقع مل سکتا ہے۔

مقننہ کے انتخابات اور اختیارات: 1962ء کے آئین کے تحت صوبائی اسمبلیوں کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی۔ قومی اسمبلی کے اراکین کا انتخاب بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کے ذمہ تھا۔ قومی اسمبلی کا کام مرکزی امور سے متعلق قانون سازی کرنا تھا تاہم ضرورت پڑنے پر صوبائی امور سے متعلق قانون سازی کا بھی حق تھا ٹیکس لگانے کا اختیار بھی مرکزی مقننہ کے پاس تھا مواخذہ جرم ثابت ہونے یا صدر کا نااہل قرار دینے والے جیسے سنگین معاملات کے واقع ہونے پر قومی اسمبلی عدالت کے طور

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

خدمات انجام دیگی۔ قومی اسمبلی دو تہائی اکثریت سے آئین میں ترمیم کرنے کی مجاز تھی اور اگر صدر کا ویٹو غیر فعال بھی ہو جاتا ہے تب بھی صدر کو متعلقہ ترمیم کے لئے انتخابی کالج سے رجوع کرنے کا حق حاصل تھا۔ صوبائی اسمبلیاں بھی اسی طریقہ کار پر عمل کریں گی۔

ایمرجنسی کا نفاذ: صدر مملکت کو ہنگامی حالات کا اعلان کرنے (ایمرجنسی لگانے) کا اختیار حاصل تھا اگر انہیں اس بات کا یقین ہو کہ ملک میں ایسی صورت حال درپیش ہے جس میں پاکستان یا اس کے کسی حصے میں جنگ کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے یا کوئی بیرونی جارحیت واقع ہوگئی ہے جس سے مملکت کا تحفظ یا اس کی معاشی زندگی متاثر ہو رہی ہے یا کوئی اندرونی گڑبڑ یا سیاسی خلفشار اتنا شدید واقع ہو کہ صوبائی حکومت اس پر قابو پانے میں ناکام ہو جائے۔

عدلیہ کا کردار: آئین میں دیئے گئے اصولوں کی روشنی میں عدلیہ قوانین اور انتظامیہ کے احکامات کی تشریح و توضیح کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔

زبانیں: اردو اور بنگالی قومی زبانیں قرار پائیں۔

1962ء کے آئین کی اسلامی شقیں:

۱۔ 1962ء کے آئین کی بنیاد قرارداد مقاصد پر رکھی گئی تھی۔

۲۔ نئے آئین میں پاکستان کو صرف جمہوریہ پاکستان قرار دیا گیا اس میں سے لفظ اسلامی نکال دیا گیا تھا لیکن جون 1962ء میں جب پہلی مرتبہ قومی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو مطالبہ کیا گیا کہ لفظ "اسلامی" شامل ہونا چاہئے اس مطالبہ کی بنیاد یہ تھی کہ اگر اسلامی شقین آئین میں برقرار رکھی گئیں تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک کو اسلامی جمہوریہ نہ کہا جائے۔ پہلی ترمیم (دسمبر 1963ء) کے ذریعہ اس شق میں لفظ "اسلامی" مملکت پاکستان کے نام میں شامل کیا گیا اور دوبارہ ملک خداداد کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔

۳۔ پالیسی کے اصولوں کے مطابق ایسے اقدامات کئے جائیں گے جن سے پاکستان کے مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگیاں اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق گزارنے کے لائق ہو سکیں گے اور انہیں ایسی سہولتیں دی جائیں گی جن کے ذریعہ ان تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔

۴۔ ایسے کسی قانون پر عمل درآمد نہیں کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں دیئے گئے اسلامی اصولوں اور تعلیمات کے منافی ہو اور موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائیگا۔

۵۔ صرف مسلمان ہی صدر کے عہدے کا اہل ہوگا۔

۶۔ قرآن اور اسلامیات کی تعلیم ہر مسلمان کے لئے لازمی ہوگی۔

۷۔ زکوۃ، وقف اور مساجد کے لئے باقاعدہ انتظامات کئے جائیں گے۔

۸۔ سماجی برائیوں جیسے شراب نوشی، جوا اور منشیات کے خاتمے کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں گے۔

۹۔ 1962ء کے آئین میں ایک خصوصی اسلامی شق متعارف کرائی گئی جس کے تحت صدر نے ایک اسلامی نظریاتی مشاورتی کونسل قائم کی اس کونسل کا کام مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سفارشات پیش کرنا تھا جن کے ذریعہ پاکستان کے مسلمان اپنی زندگی اسلام کے تصورات اور اصولوں کے مطابق گزارنے کے قابل ہو سکیں اور تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلامی تعلیمات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکے جیسا کہ قرآن وسنت میں دیا گیا ہے۔

۱۰۔ اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائیگا جو صدر مملکت قائم کریں گے۔

۱۱۔ ریاست تمام مسلم مملکتوں کے درمیان اتحاد کو مضبوط بنانے کے لئے اقدامات کریگی۔

1962ء کے آئین کے نقائص:

۱۔ اس آئین میں پاکستان کو صرف جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا تھا اور "اسلامی" کا لفظ خارج کر دیا گیا تھا بعد ازاں احتجاج کے بعد پہلی ترمیم کے ذریعہ یہ لفظ ملک کے نام میں شامل کیا گیا۔

۲۔ 1962ء کے آئین میں ابتداء ہی سے اجماع کا فقدان تھا۔ یہ آئین صرف صدر مملکت کی مرضی اور ہدایات کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ یہ آئین ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا "(بجائے ہم پاکستانی عوام کے) میں فیلڈ مارشل ایوب خان اس آئین کا اعلان اور نفاذ کرتا ہوں" یعنی ایوب خان کے لئے عوام اور رائے عامہ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس آئین کی تمام ترشقوں کے لئے تنہا صدر مملکت ذمہ دار تھا۔

۳۔ اس آئین نے صدر مملکت کو آمرانہ اختیارات فراہم کر دیئے تھے اور اسے مکمل طور پر خود مختار بنا دیا تھا جب کہ قومی اسمبلی کے اختیارات انتہائی محدود کر دیئے گئے تھے۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

اور وزراء کا تقرر اور برطرفی خود صدر مملکت کرتے تھے۔ اسکے علاوہ صدر مملکت کو قومی اسمبلی اپنی صوابدید پر تحلیل کرنے کا بھی اختیار تھا لہذا صدر مملکت کو اپنی مرضی اور صوابدید کے مطابق ریاست کے کام چلانے اور پالیسی سازی کے مکمل اختیارات حاصل تھے اور اس معاملے میں خود مختار تھے۔ لوئیس XVI کی طرح صدر ایوب بھی یہ کہہ سکتے تھے کہ "میں ہی ریاست ہوں"۔

۴۔ اس آئین کے تحت سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس شق کا مقصد ایوب خان کو سیاست دانوں سے محفوظ رکھنا تھا۔

بحیثیت مجموعی یہ ایک آمرانہ آئین تھا اور جس دن اس کا نفاذ ہوا تو حبیب جالب نے کہا۔

ایسے دستور کو
صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا
میں نہیں مانتا

1973ء کا آئین

نمایاں خصوصیات:

تحریری آئین: یہ ایک تحریری آئین ہے۔

غیر لچکدار آئین: یہ ایک غیر لچکدار آئین ہے اس آئین میں صرف ایک مخصوص طریقہ کار کے ذریعہ ترمیم کی جا سکتی ہے۔ اگر پارلیمان کے دونوں ایوانوں کی کم از کم دو تہائی اکثریت کسی ترمیم کی منظوری دے گے تو وہ صدر کی توثیق کے بعد قانون کا حصہ بنتی ہے۔

اسلامی شقیں: 1973ء کے آئین کو ایک اسلامی آئین کہا جاتا ہے کیوں کہ مملکت کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا گیا۔ صدر اور وزیر اعظم کے لئے مسلمان ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ ملک میں اسلامی اصولوں سے متصادم کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا اور موجودہ قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی تجویز منظور ہوئی۔

وفاقی نظام: آئین میں وفاقی نظام حکومت تجویز کیا گیا۔ وفاقی مقننہ امریکی طرز کے وفاقی نظام کے بجائے برطانوی پارلیمان کی طرز کی بنائی گئی۔

دو ایوانی مقننہ: 1973ء کے آئین کے تحت وفاق مقننہ دو ایوانوں پر مشتمل قرار دی گئی۔ ایوان بالا کو سینٹ اور ایوان زیریں کو قومی اسمبلی کا نام دیا گیا۔

صدر مملکت: صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے جن کی عمر 45 سال سے کم نہ ہو اور جو پارلیمان کے رکن منتخب ہونے کے اہل ہوں۔ عہدوں کی مدت پانچ سال مقرر کی گئی۔ پارلیمان میں دو تہائی اراکین کی منظور کردہ قرارداد کے ذریعے صدر کو ان کے عہدے سے معزول کیا جا سکتا ہے۔

صدر کے اختیارات: اگر پارلیمان کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو صدر مملکت آرڈیننس کا اجراء کر سکتے ہیں۔ صدر کے پاس رحم کی درخواستیں قبول کرنے کا اختیار ہوگا اور وہ تمام داخلی اور خارجی معاملات میں وزیر اعظم کے مشورے سے کام کریں گے۔

پارلیمانی طرز حکومت: اس آئین میں پارلیمانی طرز حکومت تجویز کی گئی۔ سربراہ حکومت وزیر اعظم کو بنایا گیا ہے۔ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ قومی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہونگے۔

وزیر اعظم: 1973ء کے آئین کے تحت وزیر اعظم وفاق کے چیف ایگزیکٹو ہوں گے اور وزیر اعظم کو قومی اسمبلی اکثریت سے منتخب کریگی۔

وفاق اور صوبے: وفاقی مقننہ میں پارلیمان کو قانون سازی کا مکمل اختیار ہوگا جب کہ مشترکہ امور کی فہرست میں قومی اور صوبائی اسمبلی دونوں قانون سازی کا اختیار رکھتی ہیں۔

مشترکہ مفادات کی کونسل: 1973ء کے آئین مین مشترکہ مفادات کی کونسل کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کیا گیا۔ یہ کونسل صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور وزیر اعظم کے نامزد کردہ وفاقی وزراء پر مشتمل ہوگی۔ یہ کونسل لیجسلیٹو فہرست کے حصہ دوئم میں موجود پالیسی کی تشکیل اور درستگی کی ذمہ دار ہے اور باہمی آپ میں دخل اندازی جیسی شکایت کی صورت میں یہ کونسل معاملات کی چھان بین کر سکے گی۔

قومی مالیات کمیشن: 1973ء کے آئین میں سب سے بڑی تبدیلی قومی مالیاتی کمیشن کا قیام تھا یہ کونسل وفاق اور صوبائی مالیاتی وزراء اور دیگر اراکین پر مشتمل تھی اس کا کام وفاق اور صوبوں کے مابین مالیاتی وسائل کو تقسیم کرنا تھا۔

بنیادی حقوق: 1973ء کے آئین کے تحت بنیادی حقوق میں فرد کا تحفظ، گرفتاری اور محبوس رکھنے کے خلاف تحفظات، غلامی اور جبری مشقت کی ممانعت، دہری سزا، تحریک چلانے کی آزادی، ادارے قائم کرنے کی آزادی، تبدیلی مذہب کی آزادی، مذہبی اداروں کا تحفظ، زبان وثقافت اور تحریر کا تحفظ وغیرہ شامل تھے۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

[illegible] کی ترقی، قومی زندگی میں خواتین کی بھرپور شرکت، اقلیتوں کا تحفظ، عوام کی معاشی اور سماجی فلاح

[illegible] کے لئے اہم کردار شامل ہیں۔

[illegible] 1973ء [illegible] کو تمام اداروں پر فوقیت حاصل ہے۔

[illegible] 1973ء [illegible]

1973ء کے آئین کی اسلامی دفعات

۱۔ [illegible] پوری کائنات پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور اس کی دی گئی حدود کے اندر رہتے ہوئے پاکستان کے عوام اپنے

اختیارات [illegible]

۲۔ [illegible] اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔

۳۔ [illegible]

۴۔ [illegible] پاکستان کے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی تشکیل دینے کے لئے اقدامات کئے جائیں

گے۔

۵۔ [illegible] کے لئے اقدامات کئے جائیں گے، قرآن کی غلطیوں سے پاک طباعت اور اشاعت اور عربی زبان

[illegible]

۶۔ [illegible]

[illegible] ہونے گی۔

۷۔ [illegible] فحاشی، جوئے اور فحش اور قابلِ اعتراض لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور اس کی

[illegible] اقدامات کرے گی۔

۸۔ [illegible]

۹۔ [illegible]

۱۰۔ [illegible] اور موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا جائیگا۔

۱۱۔ [illegible] پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو ایسی سفارشات دی جائیں جن کی روشنی میں مسلمانان

[illegible]

۱۲۔ [illegible] گورنر یا اسمبلی (قومی یا صوبائی) کے کل اراکین کے دو خمس کسی قانون کے اسلامی

[illegible] اسلامی کونسل میں پیش کریں گے۔

۱۳۔ [illegible] 1973ء کے آئین [illegible] "مسلمان سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی مطلق

[illegible] نبی یا مذہبی مصلح ہونے کا دعویٰ کرتا ہو یا اسے اپنا نبی یا پیشوا بنالے یا اس پر کسی

[illegible]

۱۴۔ [illegible] 1973ء [illegible] (تاریخ 17 ستمبر 1974ء) کے مطابق قادیانی گروہ یا لاہوری گروہ (جو خود کو احمدی کہتے ہیں)

[illegible]

۱۵۔ [illegible] اقدامات کرے گی۔

1973ء کا [illegible] 1973ء [illegible] کے نتیجے میں یہ آئین اپنی اصلی شکل قائم نہیں رکھ سکا۔ 1973ء

2005ء [illegible]

۱۔ [illegible]

پالیسی کا اصول: پالیسی کے اصولوں میں اسلامی طرز زندگی، مقامی اداروں کی ترقی، قومی زندگی میں خواتین کی بھرپور شرکت، اقلیتوں کا تحفظ، عوام کی معاشی اور سماجی فلاح و بہبود، مسلم دنیا کے تعلقات میں استحکام اور بین الاقوامی امن کے لئے کام کرنا شامل ہیں۔

آزاد عدلیہ: 1973ء کے آئین کے تحت عدلیہ کو ریاست کے دیگر تمام اداروں پر فوقیت حاصل ہے۔

زبان: 1973ء کے آئین کے مطابق اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔

1973ء کے آئین کی اسلامی شقیں:

۱۔ خدا کی حاکمیت: آئین کے پہلے بند میں یہ کہا گیا ہے کہ پوری کائنات پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور اس کی دی گئی حدود کے اندر رہتے ہوئے پاکستان کے عوام اپنے اختیارات کا استعمال کریں گے۔

۲۔ ریاست کا نام: سابقہ آئین کی طرح ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا۔

۳۔ ریاست کا مذہب: اسلام ریاست کا مذہب قرار پایا۔

۴۔ اسلامی طرز زندگی: اسلام کے بنیادی اصولوں اور تصورات کے مطابق پاکستان کے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی تشکیل دینے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔

۵۔ قرآن اور اسلامیات کی تعلیم: قرآن اور اسلامیات کی لازمی تعلیم کے لئے اقدامات کئے جائیں گے، قرآن کی غلطیوں سے پاک طباعت اور اشاعت اور عربی زبان سکھانے کے لئے مناسب سہولیات فراہم کی جائیں گی۔

۶۔ زکوٰۃ وقف: زکوٰۃ، وقف اور مساجد کو مناسب طور پر منظم کیا جائے گا۔

۷۔ سماجی انصاف کی فراہمی اور سماجی برائیوں کے خاتمے کے لئے اقدامات: ریاست جسم فروشی، شراب نوشی، جوئے اور فحش اور قابل اعتراض لٹریچر کی طباعت و اشاعت اور اس کی گردش کی روک تھام کے لئے اقدامات کرے گی۔

۸۔ صدر مملکت: صدر کے انتخاب کے لئے صرف مسلمان اہل ہوں گے۔

۹۔ وزیر اعظم: وزیر اعظم مسلمان ہوگا۔

۱۰۔ قرآن وسنت سے متعلق شقیں: قرآن وسنت کی تعلیمات کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور موجود قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا جائیگا۔

۱۱۔ اسلامی نظریاتی کونسل: اسلامی نظریاتی کونسل بنائی جائیگی جس کے ذمہ یہ ہوگا کہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو ایسی سفارشات دی جائیں جن کی روشنی میں مسلمان پاکستان اپنی زندگی اسلام کے اصولوں کے مطابق گزار سکیں۔

۱۲۔ اسلامی کونسل کے لئے مجلس شوریٰ (قومی اسمبلی) کا ریفرنس: اگر صدر یا صوبے کے گورنر یا اسمبلی (قومی یا صوبائی) کے کل ارکان کے دو تہائی کسی قانون کے اسلامی اصولوں کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے متعلق سوال اٹھائیں یا مشورہ دیں تو وہ اسے اسلامی کونسل میں پیش کریں گے۔

۱۳۔ مسلمان کی تعریف: 1973ء کے آئین میں پہلی مرتبہ مسلمان کی باقاعدہ تعریف بیان کی گئی جس کے مطابق "مسلمان سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور اکرم ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے پر یقین رکھتا ہو۔ اگر وہ کسی اور شخص کو جو نبی یا مذہبی مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اسے اپنا نبی یا پیشوا بنالے یا اس پر کسی بھی حد تک یقین رکھے تو وہ مسلمان نہیں ہوگا۔

۱۴۔ احمدی یا غیر مسلم اقلیت: 1973ء میں کی جانے والی دوسری ترمیم (تاریخ نفاذ 17 ستمبر 1974ء) کے مطابق قادیان گروہ یا لاہوری گروہ (جو خود کو احمدی کہتے ہیں) غیر مسلم اقلیت قرار پائے۔

۱۵۔ مسلم دنیا سے روابط کو مستحکم کرنا: ریاست تمام مسلم ممالک کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے لئے اقدامات کرے گی۔

1973ء کے آئین میں ترامیم: 1973ء کے آئین میں اس کے نفاذ کے بعد کئی ترامیم ہوئیں جس کے نتیجہ میں یہ آئین اپنی اصلی شکل قائم نہیں رکھ سکا۔ 1973ء سے 2005ء کے درمیان سترہ ترامیم کی گئیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ **پہلی ترمیم:** بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے نتیجہ میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث پہلی ترمیم کی گئی۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

۲۔ دوسری ترمیم: احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا۔

۳۔ تیسری ترمیم: امتناعی نظر بندی کا عرصہ ایک مہینے سے بڑھا کر تین مہینے کر دیا گیا اور اس کے لئے وجوہات بیان کرنے کا عرصہ سات دن سے بڑھا کر چودہ دن کر دیا گیا۔

۴۔ چوتھی ترمیم: چوتھی ترمیم میں رٹ کے سلسلے میں ہائی کورٹ کے اختیارات کم کر دیئے گئے تا کہ معزز عدالت انسدادی نظر بندی پر کوئی پابندی عائد کر سکے اور نہ ہی نظر بندی کو کوئی ضمانت منظور کر سکے۔

۵۔ پانچویں ترمیم: یہ بھی عدلیہ سے متعلق تھی اس کے تحت ہائی کورٹ کے ججوں کے بین اصوبائی تبادلے کئے جاسکتے تھے۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے کی میعاد پانچ سال اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے کی میعاد چار سال مقرر کی گئی جس کے تعد وہ یا تو خدمت سے سبکدوش ہو جائیں گے یا سبکدوش ہونے ہونے تک کے عرصہ میں اپنی عدالت میں بطور جج کام کرتے رہیں گے۔

۶۔ چھٹی ترمیم: اس ترمیم کے تحت سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحبان کو اس بات کی اجازت دی گئی کو وہ ریٹائر ہونے کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی اپنے عہدے کی معیاد پوری کر سکتے ہیں۔

۷۔ ساتویں ترمیم: اس ترمیم کے ذریعہ کسی معاملہ میں رائے شماری (ریفرنڈم) کرانے کا اختیار وزیر اعظم کو دیا گیا۔

۸۔ آٹھویں ترمیم: اس ترمیم کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ صدر مملکت کے انتخابی کالج میں تندیلی کی تئی اس میں مجلس شوریٰ کے ساتھ چاروں صوبائی اسمبلیاں بھی شامل کر دی گئیں اور ہر صوبائی اسمبلی کو مساوی حیثیت دی گئی۔

۲۔ صدر مملکت کو وزیر اعظم اور کابینہ سے مشورے کے مطابق عمل کرنا ضروری قرار پایا گیا لیکن صدر کو اس بات کا مجاز قرار دیا گیا کہ وہ کابینہ کے مشورے کے مطابق کو نظر ثانی کرن کے لئے دوبارہ کابینہ بھیج سکتے ہیں۔

۳۔ صدر مملکت کی طرف سے منظوری سینے کی مدت 45 دن سے گھٹا کر 30 دن کر دی گئی۔ مالیاتی بل کے علاوہ دیگر تمام بلوں کو صدر مملکت ویٹو کر سکتے ہیں اور ان پر دوبارہ نور کرنے کے لئے بھیج سکتے ہیں۔

۴۔ صدر مملکت اپنی ذاتی صواندید پر قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کا اختیار رکھتے تھے تاہم اگر ان کی رائے میں قومی اسمبلی آئین کے خلاف ورزی کی مرتکب ہو رہی ہو تو منتخب کنندہ سے رجوع کرنا ضروری ہوگا تاہم اسمبلی کی تحلیل کے بعد انتخابات کرانے کی مدت 100 دن سے گھٹا کر 90 دن کر دی گئی۔

۵۔ قومی اسمبلی کی تحلیل کے بعد صدر مملکت اپنی ذاتی صوابدید پر قائم مقام کابینہ تشکیل دے سکتے ہیں حتیٰ کہ اگر خود وزیر اعظم کے مشورے سے قومی اسمبلی تحلیل کی گئی ہو تب بھی وزیر اعظم کا اپنے عہدے پر برقرار رہنا یقینی نہیں تھا۔ 1985ء کے صدارتی حکم نمبر 14 میں شق 94 کو تبدیل کیا گیا جس کے تحت صدر مملکت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید پر وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو اپنے عہدے پر برقرار رہنے دیں یا نیا قائم مقام وزیر اعظم اور کابینہ کا تقرر کریں۔

۶۔ صدر مملکت کو اپنی صوابدید پر چیف آف آرمی اسٹاف اور چیف الیکشن کمشنر کے تقرر کا اختیار تھا۔

۷۔ وزیر اعظم کی تقرری سے متعلق صدر کا خصوصی اختیار صرف 20 مارچ 1990ء تک محدود تھا۔ اس تاریخ کے بعد صدر مملکت قومی اسمبلی کے ازاکین سے وزیر اعظم کے انتخاب کے لئے رجوع کر سکتے تھے۔

۸۔ صدر کو اپنی صوابدید پر صوبوں کے گورنروں کی تقرری کا اختیار تھا مگر وزیر اعظم سے مشورہ کرنے کی شرط رکھی گئی۔

۹۔ نیشنل سیکیورٹی کونسل کی تشکیل سے متعلق سے متعلق شق 152-A کو حذف کر دیا گیا۔

۱۰۔ معمولی سے ترمیم کے ساتھ مرشل لاء حکومت کے قوانین عمل اور احکامات سے متعلق شق 270-A کو برقرار رکھا گیا۔

۱۱۔ سینیٹ کے اراکین کی تعداد 63 سے بڑھا کر 87 کر دی گئی جس میں ہر صوبے کے لئے ٹیکنو کریٹ علماء اور پیشہ ورانہ ماہرین کے لئے پانچ پانچ نشستیں مختص کی گئیں۔

۱۲۔ قومی اسمبلی میں خواتین کے لئے مختص نشستوں کی تعداد 10 سے بڑھا کر 20 کر دی گئی۔

۱۳۔ عدم اعتماد کے لئے ووٹنگ کا طریقہ کار تبدیل کر دیا گیا اور ایسی تحریک کی صورت میں متبادل امیدوار کی ضرورت کو ختم کر دیا گیا۔

۱۴۔ آٹھویں ترمیم میں شق 2A اور 203-A سے 203-J تک شقیں شامل شامل کی گئیں ان ترامیم کے نتیجہ میں وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں آیا اور اس عدالت کو حسب ذیل اختیارات دیئے گئے۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

i۔ یہ فیصلہ کرنا کہ قانون ساز اسمبلی کا منظور کیا ہوا کوئی قانون اسلامی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں۔

ii۔ زندگی کے تمام شعبہ جات بشمول معاشیات کے حکومت کے کیے گئے اقدامات اور قوانین کے بارے میں اپنا فتویٰ دینا (کہ یہ اسلامی ہے یا نہیں)۔ یہ 1990ء

موثر ہوا۔

نویں ترمیم: یہ شریعت بل کہلاتی ہے۔ اس کا مقصد قرآن وسنت کے مطابق اسلام کا مقننہ کا ذریعہ رہنمائی اور اعلیٰ ترین قانون بنانا مقصود تھا۔ بل سینیٹ سے منظور ہو گیا لیکن 1985ء میں جونیجو حکومت کی اچانک برطرفی کی وجہ سے یہ بل اسمبلی میں پیش نہیں کیا جا سکا اور یہ ترمیم غیر موثر ہو گئی۔

دسویں ترمیم: اس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ کے اجلاسوں کے مابین وقفہ 130 دن سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

گیارہویں ترمیم: گیارہویں ترمیم ابھی زیر غور ہے اس کا مقصد قومی اور صوبائی اسمبلی میں خواتین کی نشستوں کی بحالی ہے۔

نوٹ: الیکشن آرڈر 2002ء نے قومی اور صوبائی اسمبلی میں خواتین کی نشستوں کو بحال کر دیا ہے۔

بارہویں ترمیم: امن وامان کے شدید مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بارہویں ترمیم کے ذریعہ تین سال (14 اگست 1991ء تا 14 اگست 1994ء) سرسری سماعت کی عدالتیں قائم کی گئیں۔

تیرہویں ترمیم: یہ ترمیم دراصل آئین کی مختلف شقوں میں چار ترامیم پر مشتمل تھی۔ بنیادی طور پر اس کے ذریعہ آئین سے شق (58(2-B کو ختم کر دیا گیا جس کے تحت صدر کو اپنی ذاتی صوابدید پر قومی اسمبلی تحلیل کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اسی طرح سے شق 112 (2-B) کو بھی ختم کر دیا گیا اس شق میں گورنروں کو صوبائی اسمبلیاں کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ شق 101 کی دفعہ میں بھی ترمیم کی گئی جس کے تحت گورنروں کی تقرری کے لئے صدر مملکت کو وزیراعظم سے مشورہ کا پابند کر دیا گیا۔ اس صدر مملکت کیلئے وزیراعظم سے صرف رجوع کرنا کافی تھا لیکن اب وہ وزیراعظم کی منظوری یا مشوری کے بغیر گورنروں کی تقرری کا اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ شق (2-B) کے تحت صدر مملکت کو سربراہان افواج کے تقرر کا جو اختیار حاصل تھی اس میں بھی ترمیم کے ذریعے یہ تبدیلی کی گئی کہ صدر کا وزیراعظم کو صرف مطلع کرنا کافی نہیں وزیراعظم سے مشوری کے پابند ہوں گے۔

چودہویں ترمیم: اس ترمیم کے ذریعہ آئین میں ایک نئی شق A-63 کا اضافہ کیا گیا جس کے ذریعے ہارس ٹریڈنگ اور سیاسی بلیک میلنگ کا راستہ بند کر دیا گیا اور یہ قانو گیا کہ اسمبلی کا کوئی بھی رکن اگر جماعتی نظم وضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرتا ہے یا پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی کے خلاف ووٹ دیتا ہے تو وہ پارلیمان میں اپنی نشست ہو جائیگا۔

پندرہویں ترمیم: قرآن وسنت کو سپریم قانون قرار دینے کے لئے پندرہویں ترمیم کا بل قومی اسمبلی سے منظوری حاصل کرنے کے بعد سینٹ میں زیر غور ہے۔

سولہویں ترمیم: کوٹہ سسٹم کی میعاد میں مزید 20 سال کا اضافہ کیا گیا۔ صوبے کے لفظ کو وفاقی اکائی قرار دیا گیا اس ترمیمی بل میں آئین کی ان دفعات میں ضرور کردی گئی ہیں جہاں فیڈریشن کے متعلقہ امور ترمیم طلب تھے۔

سترھویں ترمیم: قومی اسمبلی نے 29 دسمبر 2003ء کو سترہویں ترمیم منظور کی۔ اگلے دن 30 دسمبر کو سینیٹ نے بھی اس ترمیم کی منظوری دے دی اس بل کی نمایاں خص یہ ہیں۔

۱۔ یہ ایکٹ جو سترہویں ترمیم کا ایکٹ کہلائے گا فوراً نافذ العمل ہوگا۔

۲۔ اس ایکٹ نے 12 اکتوبر 1999ء کے بعد کئے گئے جنرل پرویز مشرف کے تمام اقدامات کو قانونی تحفظ دیا۔

۳۔ اس بل کے ذریعے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور صوبائی اسمبلیوں سے صدر کا اعتماد کا ووٹ دیا گیا۔

۴۔ نئے قانون کے ذریعے جنرل پرویز مشرف کو بیک وقت صدر مملکت اور چیف آف آرمی کے دونوں عہدے 31 دسمبر 2004ء تک اپنے پاس رکھنے کی اجا گئی۔

۵۔ اس کے تحت صدر مملکت پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور ہر صوبائی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے بعد پانچ سال کی مدت کے لئے منتخب صدر ق گے۔ اس قانون میں کہا گیا کہ سترہویں ترمیم کے ایکٹ کے نفاذ کے تیس دن کے اندر اندر صدر مملکت کو اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا ہوگا۔

۶۔ آئین کی شق 58 میں ترمیم کر کے صدر مملکت کے قومی اسمبلی تحلیل کرنے اور وفاقی حکومت کو برطرف کرنے کے اختیار کو بحال کیا گیا۔ تاہم ایسی صورت

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

مملکت کو قومی اسمبلی کی تحلیل کے بعد پندرہ دن کے اندر اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے جانا ہوگا اور سپریم کورٹ تیس دن میں اس ریفرنس پر اپنا فیصلہ دے گی جو حتمی ہوگی۔
۷۔ اسی طرح سے گورنروں کو اپنی صوبائی اسمبلیاں تحلیل کرنے اور صوبائی حکومت کو برطرف کرنے کا اختیار ہوگا۔ تاہم ایسی صورت میں صدرِ مملکت کی منظوری کے بعد صوبائی اسمبلی کی تحلیل کے بعد پندرہ دن کے اندر اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے جانا ہوگا اور سپریم کورٹ تیس دن میں اس ریفرنس پر اپنا فیصلہ دیگی۔
۸۔ اس بل کے ذریعے صدرِ مملکت کو یہ اختیار دیا گیا کہ وزیراعظم کے مشورہ سے افواج کے سربراہان کا تقرر کرسکیں گی۔
۹۔ ہائیکورٹ کے جج صاحبان کے لئے ریٹائرمنٹ کی عمر 62 سال کردی گئی ماسوا اس کے کہ وہ خود قبل از وقت استعفیٰ دے دے یا اسے عہدے سے برطرف کردیا جائے۔

1956ء، 1962ء اور 1973ء کے آئین کا تقابلی موازنہ

1973ء کا آئین	1962ء کا آئین	1956ء کا آئین	نمبر شمار
اس میں 280 دفعات شامل ہیں جن کو 7 حصوں اور 7 جدولوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔	اس میں 250 دفعات تھیں جن کو 12 حصوں اور 3 جدولوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔	اس میں 234 دفعات تھیں جن کو 13 حصوں اور 6 جدولوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔	1
یہ ایک تحریری آئین تھا۔	یہ ایک تحریری آئین تھا۔	یہ ایک تحریری آئین تھا۔	2
یہ ایک غیر لچکدار آئین تھا۔	یہ ایک غیر لچکدار آئین تھا۔	یہ ایک غیر لچکدار آئین تھا۔	3
یہ ایک اسلامی آئین ہے اس کا دیباچہ قراردادِ مقاصد پر مبنی ہے۔	یہ ایک اسلامی آئین تھا اس میں اسلام کی روح مفقود تھی۔	یہ ایک اسلامی آئین تھا اس کا دیباچہ قراردادِ مقاصد پر مبنی تھا۔	4
اس آئین میں منسوخی کے خلاف تحفظ فراہم کیا گیا ہے اور جو شخص اس آئین کو منسوخ کرے اس کو غداری کے لئے جو سزا ہے وہی سزا دی جائیگی۔	اس آئین میں منسوخی کے خلاف کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا۔	اس آئین میں منسوخی کے خلاف کوئی تحفظ فراہم نہیں کیا گیا تھا۔	5
آئین میں پارلیمانی طرزِ حکومت تجویز کی گئی ہے جس میں حقیقی اختیارات وزیراعظم کو حاصل ہیں لیکن آٹھویں اور بعد ازاں سترہویں ترمیم نے وزیراعظم کے مقابلے میں صدرِ مملکت کو زیادہ اختیار بنا دیا ہے۔	آئین میں صدارتی طرزِ حکومت تجویز کی گئی تھی صدرِ مملکت کو غیر معمولی اختیارات حاصل تھے اور وہ ملک کی انتظامیہ کے لئے مکمل طور پر ذمہ دار تھے۔	آئین میں پارلیمانی طرزِ حکومت تجویز کی گئی جس میں اصل اختیارات وزیراعظم کو حاصل تھے صدرِ مملکت کو بھی اہم اختیارات حاصل تھے۔	6
صدر قومی اسمبلی تحلیل کرسکتا ہے تاہم تحلیل کے بعد اس کے عمل کی توثیق سپریم کورٹ سے کرانی ہوگی	صدرِ مملکت کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جب چاہے قومی اسمبلی کو تحلیل کرسکتا ہے لیکن اس شرط پر کہ انہیں تحلیل کرنے کے نتیجے میں خود اسے بھی صدارت چھوڑنا ضروری ہو جاتا اور پھر صدرِ مملکت اور قومی اسمبلی کے لئے ازسرِ نو انتخابات ضروری ہو جاتے۔	کابینہ کی ہدایت پر صدرِ مملکت قومی اسمبلی کو تحلیل کرسکتا ہے۔	7

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

8	قومی اسمبلی کے اراکین کے انتخاب کیلئے راست اور مشترکہ انتخابی کالج کا طریقہ اپنایا گیا تھا۔ پاکستان کے ہر شہری کو ووٹ دینے کا حق تھا جس کی عمر 21 سال سے کم نہ ہو۔	صدر مملکت اور قومی اسمبلی کے اراکین کے انتخاب کے لئے بنیادی جمہوریت کا بالواسطہ طریقہ اپنایا گیا تھا۔ ہر پاکستانی بنیادی جمہوریت کے امیدوار کو ووٹ دے سکتا تھا جس کی عمر 21 سال سے کم نہ ہو۔ اس طرح بنیادی جمہوریت کے منتخب اراکین کالج بناتے تھے جس کا کام صدر مملکت اور اراکین قومی اسمبلی کا انتخاب کرنا تھا۔	اراکین قومی اسمبلی کے انتخاب کے لئے راست اور جداگانہ انتخابی کالج کا طریقہ اپنایا گیا۔ ہر پاکستانی کو ووٹ دینے کا حق ہے جس کی عمر 18 سال سے کم نہ ہو۔ سینیٹ کے اراکین کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کریں گے۔
9	آئین میں اعلان کیا گیا کہ پارلیمان میں صرف ایک ایوان ہوگا جس کو قومی اسمبلی کہا جائے گا اور اس میں ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان مساوات کو قائم رکھا جائیگا۔	آئین میں اعلان کیا گیا کہ پارلیمان میں صرف ایک ایوان ہوگا جس کو قومی اسمبلی کہا جائے گا اور اس میں ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان مساوات کو قائم رکھا جائیگا۔	آئین اعلان کرتا ہے کہ پارلیمان کے دو ایوان ہونگے ایوانِ بالا کو سینیٹ کہا جائیگا اور ایوانِ زیریں کو قومی اسمبلی کہا جائیگا۔ ہر صوبہ کو سینیٹ میں مساوی نمائندگی حاصل ہوگی۔
10	آئین میں وفاقی نظام فراہم کیا گیا۔ مرکز کو بہت زیادہ اختیارات سونپے گئے مثلاً ہنگامی حالات کا اعلان کرنا اور اس دوران یکطرفہ اقدامات کرنا جس سے صوبائی خودمختاری متاثر ہوسکتی تھی۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان تقسیم اختیارات کی تین فہرستیں وفاقی ،بائی اور مشترکہ	آئین میں وفاقی نظام فراہم کیا گیا مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان واضح طور پر اختیارات تقسیم کئے گئے تھے مرکز کے لئے واحد فہرست تھی مثلاً دفاع، امور خارجہ کرنسی وغیرہ، اور باقی اختیارات صوبوں کو سونپے گئے	آئین وفاقی نظام فراہم کرتا ہے۔ بہت بڑی حد تک آئین میں صوبائی خودمختاری دی گئی ہے مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے لئے دو فہرستیں ہیں وفاقی لیجسلیٹو فہرست اور مشترکہ لیجسلیٹو فہرست
11	آئین میں عمومی جمہوری حقوق اور آزادیاں مکمل طور پر فراہم کی گئیں تھیں جو عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ تمام سول حقوق آئین میں منظور کئے گئے تھے۔ عدلیہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بنیادی حقوق کا نفاذ کرے اور عدالتوں کو یہ فیصلہ کرنے کا حق تھا کہ آیا کوئی قانون بنیادی حقوق کے مقاصد سے متصادم تو نہیں۔	آئین میں "حقوق کے بل" کو وجود تک نہیں تھا جس تحت بنیادی آزادیاں یا شہریوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہو لیکن دسمبر 1963ء کی پہلی منظور شدہ ترمیم میں اس قسم کا بل شامل کیا گیا اور عدالتوں کو بنیادی حقوق کا محافظ قرار دیا گیا۔ بنیادی حقوق کی شق محدود تھی اور قبائلی علاقہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا اس کے علاوہ تقریباً 31 قوانین کے تحت آنے والی سرگرمیوں پر بھی اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا مثلاً آزادی تقریر، پریس وغیرہ اس حد تک آزاد تھے جتنا صدر مملکت چاہتے تھے۔	آئین میں بنیادی حقوق فراہم کئے گئے ہیں عدلیہ کو بنیادی حقوق کے نفاذ کا اختیار دیا گیا ہے اور عدالتوں کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا گیا کہ آیا کوئی قانون بنیادی حقوق سے متصادم تو نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود احتیاطی نظر بندی کی شق اب تک آئین میں باقی ہے جو انسانی حقوق کے منافی ہے۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

12	اس آئین میں عدلیہ کو ریاست کے دوسرے شعبوں پر بالادستی حاصل تھی۔	عدلیہ قوانین اور انتظامی احکام کی تاویل کرنے کی ذمہ دار تھی جس کے لئے آئین میں اصول بیان کئے گئے تھے لیکن اسے یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ قومی اسمبلی کے بنائے ہوئے کسی قانون کو کالعدم قرار دے۔	آئین میں عدلیہ کو مکمل بالادستی حاصل ہے جو وہ ریاست کے دوسرے شعبوں پر استعمال کر سکتی ہے۔
13	اردو اور بنگالی کو قومی زبانوں کا درجہ دیا گیا۔	اردو اور بنگالی کو قومی زبانوں کا درجہ دیا گیا۔	اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔
14	آئین میں ریفرنڈم کرانے کا کوئی موقع فراہم نہیں کیا گیا۔	صدر مملکت اور قومی اسمبلی کے درمیان اختلاف رائے کی صورت میں صدر مملکت چاہے تو مسئلے کو انتخابی کالج (بنیادی ڈیموکریٹس) کے پاس ریفرنڈم کیلئے لے جا سکتا ہے۔	صدر مملکت اپنی صوابدید پر یا وزیراعظم کی ہدایت پر ریفرنڈم کسی بھی اہم قومی مسئلہ پر منعقد کرا سکتا ہے۔
15	کراچی کو ملک کا وفاقی دارالخلافہ قرار دیا گیا۔	آئین میں دو دارالخلافے مقرر کئے گئے اسلام آباد کو وفاقی دارالخلافہ اور ڈھاکہ کو قومی اسمبلی کی اصل نشست اور ملک کا دوسرا دارالخلافہ تسلیم کیا گیا۔	اسلام آباد کو ملک کا وفاقی دارالخلافہ بنایا گیا۔

پاکستان کی جغرافیائی حیثیت

پاکستان کا محل وقوع: پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا ملک دنیا کے سب سے بڑے براعظم ایشیا میں واقع ہے۔ اس کی کل لمبائی 1440 کلومیٹر اور چوڑائی 320 کلومیٹر ہے۔ یہ 6105 اور 7505 مشرقی طول بلد اور 24050 اور 36075 شمالی عرض بلد کے درمیان واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ 796096 کلو میٹر ہے۔

پاکستان کے مشرق میں بھارت کا صوبہ مشرقی پنجاب اور جنوب مشرق میں راجستھان کا صحرا واقع ہے۔ جنوب میں بحیرہ عرب اور جنوب مغرب میں ایران کی اسلامی مملکت سے سرحدیں ملتی ہیں۔ مغرب اور جنوب میں ایران کی اسلامی مملکت سے سرحدیں ملتی ہیں۔ مغرب میں افغانستان کی اسلامی مملکت ہے۔ مغرب میں روس اور آزاد مسلم ریاستیں ہیں۔ جن کی سرحدیں پاکستان سے قریب تر ہیں کیونکہ درمیان میں افغانستان کا علاقہ اسے پاکستان سے جدا کرتا ہے یہ علاقائی پٹی 20 کلومیٹر چوری ہے۔ پاکستان کے شمال میں کوہ قراقرم کے پار چین اس کا عظیم ہمسایہ دوست ملک ہے جس کے پاکستان کے ساتھ شروع ہی سے خوشگوار تعلقات اور دوستانہ مراسم قائم ہیں۔ پاکستان کے شمال میں گلگت اور ہنزہ کے پار شمال مشرق کی جانب کوہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے ہیں جہاں سارا سال برف پڑتی رہتی ہے۔ سیاچین گلیشیر کا علاقہ اسی جگہ پر واقع ہے۔ چین اور پاکستان کے درمیان صدیوں سے تجارتی اور ثقافتی روابط قائم ہیں۔

دنیا کے نقشے میں پاکستان کی جغرافیائی اہمیت وافادیت: پاکستان دو بڑی طاقتوں کا ہمسایہ ہے۔ شمال میں عوامی جمہوریہ چین اور شمال مغرب میں روس واقع ہے۔ اول الذکر کی وجہ شہرت اس کی عدم مداخلت کی پالیسی ہے۔ چین اور پاکستان کے درمیان بڑے دوستانہ تعلق قائم ہیں۔ دونوں کے درمیان تجارتی تعلقات قابل رشک ہیں۔ روس بھی پاکستان کا ہمسایہ ہے۔ یہ دنیا کی ایک بڑی طاقت ہے۔ ازمنہ قدیم سے روس کی گرم پانی کے سمندر تک رسائی کی خواہش رہی۔ چونکہ بحیرہ عرب تک رسائی کے لئے روس کو پاکستان سے راستہ پڑتا ہے۔ اس بنا پر پاکستان کی اہمیت میں اضافہ ہوگیا۔ چین اور روس کے درمیان تعلقات کشیدہ ہیں۔ روس خلیجی ریاستوں اور بحیرہ عرب تک رسائی کے لئے پاکستان میں اپنے اثر ورسوخ کو قائم کرنے میں سرتوڑ کوشش میں مصروف رہا ہے۔ بھارت بڑی طاقتوں میں شمار ہوتا ہے یہ پاکستان کا ہمسایہ ہے۔ روس بھارت تعلقات کی بنا پر پاکستان کا درمیان میں واقع ہونا اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

پاکستان جغرافیائی پوزیشن کے لحاظ سے عالم اسلام کے وسط میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں بنگلہ دیش، ملائشیا، انڈونیشیا اور برونائی اور مغرب میں افغانستان، ایران، سعودی عرب، خلیجی ریاستیں، عراق اردن، شام، ترکی، مصر، لیبیا، الجزائر، مراکش اور تیونس واقع ہیں۔ چنانچہ محل وقوع کے اعتبار سے مضبوط اور فوجی الحاظ سے ناقابل تسخیر ہے۔ پاکستان بین الاقوامی سیاست میں اسلامی دنیا کا قائد ہے۔ اس نے جنرل اسمبلی میں پورے اسلامی بلاک کی قیادت کی۔ 1980ء میں سارے اسلامی ممالک کی طرف سے پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ جو کہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ 1979ء کی ہوانا کانفرنس میں قیادت پاکستان کے حصے میں آئی۔ پاکستان اس عہدے پر سات سال تک قائز رہا۔ مسلمانوں عالم راہنمائی کے لئے پاکستان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ محل وقوع کے لحاظ سے پاکستان روسی توسیع کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے روس افغانستان تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اور اس کے آگے اس کی منزل گرم پانی کے سمندر اور تیل کے میدانوں تک تھی۔ اگر روس اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو مغربی دنیا اور امریکہ کو تیل کی ترسیل میں رکاوٹ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ مگر پاکستان اس کی اس خواہش اور ارادوں کی آڑ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ آج روس کی وہ حالت نہ رہی اور وہ اپنی وسعت کو محدود کرنے پر مجبور ہو گیا۔ پاکستان جغرافیائی اعتبار سے ایشیا اور یورپ کے درمیان واقع ہے۔ پاکستان کا یورپی ممالک کے ساتھ ریلوے ہوائی اور سمندری رابطہ ہے۔ دنیا کی تقریباً تمام ہوائی کمپنیوں کے جہاز پاکستان سے ہو کر گزرتے ہیں۔ یورپی تجارت پاکستان کے علاقائی سمندری راستے سے جنوبی ایشیا اور مشرق بعید کے ممالک کے ساتھ قائم ہے۔ براعظم یورپ اور ایشیا کے درمیان بحری راستہ پر واقع ہونے کی وجہ سے پاکستان کی نقطہ نظر سے نہایت اہم جگہ پر واقع ہے۔ بحر ہند آج کل بڑی طاقتوں کے حصول اقتدار کی توجہ کا مرکز ہے۔ امریکہ اور روس ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ پاکستان بحر ہند کی شاخ بحیرہ عرب پر واقع ہے۔ لہٰذا اس کی دفاعی حیثیت بے حد حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

پاکستان کا طبعی خدوخال

طبعی حالت: رقبے کے لحاظ سے پاکستان ایک وسیع ملک ہے جس میں ہر قسم کی سطح زمین پائی جاتی ہے اس میں ایک طرف بلند و بالا پہاڑوں کے سلسلے ہیں جن کی چوٹیاں سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں تو دوسری طرف دریاؤں سے لائی ہوئی زرخیز اور نرم مٹی سے بنا ہوا میدانی علاقہ موجود ہے جس کا شمار اعلیٰ زمینوں میں ہوتا ہے۔ سطح مرتفع کے علاقے بھی ہیں جن پر کبھی کبھی کم بارش ہوتی ہے اور کچھ علاقے بالکل خشک رہتے ہیں۔ اس سرزمین میں مری اور نتھیا گلی جیسے صحت افزا ٹھنڈے مقامات بھی ہیں اور اسی ملک کا شہر جیکب آباد ہے جو دنیا کے گرم ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ طبعی خدوخال کے اعتبار سے پاکستان کو ہم تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ پہاڑی علاقے ۲۔ سطح مرتفع ۳۔ میدانی علاقے

پہاڑی علاقوں اور سطوح مرتفع کے علاقے پاکستان کے رقبے کا 60% فی صد ہیں اور باقی 40% فی صد میدانی ہے۔

کوہ قراقرم: اس سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی گاڈون آسٹن ہے جسے عام طور پر K-2 بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے 28260 فٹ بلند ہے۔ سردیوں میں یہاں برف گرتی ہے وادی گلگت اس سلسلہ کوہ کے دامن میں واقع ہے دریائے سندھ اس وادی سے جنوب کی سمت میدانی علاقے کی طرف بہتا ہے۔

کوہ ہمالیہ: اس سلسلے میں سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ ہے جس کا شمار دنیا کی بلند ترین چوٹی میں ہوتا ہے۔ یہ نیپال میں واقع ہے پاکستان کے علاقے میں ہمالیہ کے سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی نانگا پربت ہے جو کشمیر میں واقع ہے۔ اس کی بلند 26660 فٹ ہے۔ یہاں سارا سال برف رہتی ہے اس لئے یہ برفائی گھر کہلاتے ہیں پاکستان کے تقریباً سارے دریا انہی پہاڑوں سے نکلتے ہیں ان کی اوسط بلندی 19000 فٹ ہے۔

لداخ کا پہاڑی سلسلہ: ہمالیہ کے بلند پہاڑوں کے شمال میں نسبتاً کم بلندی کے پہاڑی سلسلے کو لداغ کا پہاڑی سلسلہ کہتے ہیں۔

ہمالیہ کبیر: دنیا کی بلند ترین چوٹیاں اس سلسلے میں موجود ہیں۔ یہاں سارا سال برف موجود رہتی ہے کشمیر کی خوبصورت دوادی ہمالیہ کے سلسلے پیر پنجال اور ہمالیہ کبیر کے درمیان واقع ہے۔

ہمالیہ صغیر: وسطی ہمالیہ سے نیچے 15 ہزار فٹ کے قریب ان پہاڑوں میں پاکستان کے خوب صورت صحت افزا مقامات میں نتھیا گلی، مری، ایوبیہ اور ایبٹ آباد واقع ہیں وادی کاغان بھی اس کا حصہ ہے۔

شوالک کی پہاڑیاں: شمالی علاقے اور مغربی علاقے کے درمیان اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے ان کو تلسی کی پہاڑیاں بھی کہا جاتا ہے ان کی بلندی اوسطاً "3000 فٹ

Lecturer SHAIKH ZAHOORI

یہاں سے دریائے جہلم نکلتا ہے اور منگلا کے مقام پر دریائے جہلم کے پانی سے بجلی حاصل کی جاتی ہے۔

مغربی پہاڑی علاقہ: کوہ ہندوکش کے ملا ہوا پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ ہے جن میں سوات اور چترال کے پہاڑ کوہ سفید، کوہ سلیمان اور وزیرستان کی پہاڑیاں شامل ہیں۔ سوات اور چترال کے پہاڑ کو ہندوکش کے دریائی کابل تک پھیلے ہوئے ہیں ان پر شدید برف باری ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے چترال کے راستے بند ہوجاتے ہیں۔ دریائے کابل کے جنوب میں کوہ سفید ہے جو برف سے ڈھکا رہتا ہے کوہ سلیمان کی بلندترین چوٹی تخت سلیمان ہے اس کی بلندی 11300 فٹ ہے جس میں درہ ٹوچی، درہ کرم، درہ گومل اور بولان واقع ہیں۔

سطح مرتفع: سطح مرتفع کا لفظی مطب اونچی سطح ہے علم جغرافیہ کی رو سے سطح مرتفع ایسے وسیع وعریض ناہموار خطے کو کہا جاتا ہے جو سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ یا اس سے زیادہ بلند ہو لیکن اس میں پہاڑی سلسلوں کی طرح نشیب وفراز نہ ہوں۔

سطح پر تفع پوٹھوہار اور کوہستان نمک: سطح مرتفع پوٹھوہار دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیانی علاقے میں کوہ نمک کے شمال میں واقع ہے ہر سطح، مرتفع پنجاب سے شمال مغرب میں راولپنڈی، جہلم اور اٹک کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ سطح سمندر سے ایک ہزار دو ہزار فٹ یک بلند ہے۔ سطح مرتفع پوٹھوہار کے جنوب میں پھیلا ہوا نیچے پہاڑوں اور ان میں گھرے ہوئے میدانوں کا سلسلہ سالٹ رینج یا کوہستان نمک کہلاتا ہے ان علاقے میں دنیا کا سب سے زیادہ نمک پایا جاتا ہے۔

سطح مرتفع بلوچستان: سطح مرتفع بلوچستان میں کاکٹر، چاغی، مکران اور بروہی کی پہاڑیاں شامل ہیں زیادت کا علاقہ سرسبز ہے اور باقی تمام علاقہ خشک اور بنجر پہاڑیوں پر مشتمل ہے بلوچستان میں ژوب کے سوا کوئی قابل ذکر دریا نہیں ہے برسات کے دنوں میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پہاڑی نالے بارش کا پانی بہا کر لاتے ہیں جو جھیل

پاکستان کے معاشی مسائل

پاکستان کو 2007 کے اختتام پر قائم ہوئے 64 برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ یہ مدت کسی ملک وقوم کی خاطر خواہ معاشی ترقی کیلئے بہت بڑی ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان ابھی تک ترقی پزیر حالت میں ہے اس کی معیشت کے بنیادی شعبے یعنی زراعت اور صنعت ابھی تک نیم ترقی یافتہ حالت میں ہیں۔ آبادی کا 75 فیصد ابھی تک ناخواندہ ہے۔ فی کس آمدنی 480 ڈالر سے زیادہ نہیں ہے۔ معاشی جدوجہد میں عملی حصہ لینے والی آبادی کا تناسب 35 فیصد کے لگ بھگ ہے۔ قومی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے حاصل کردہ غیر ملکی قرضوں کے بوجھ میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اب تک معاشی ترقی کیلئے انتھک کوششیں کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں مگر مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ اس کی بھی متعدد وجوہات ہیں۔ درحقیقت ملک متعدد ایسے معاشی مسائل سے دوچار ہے جو معاشی ترقی کی خاطر خواہ رفتار اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں سنگین رکاوٹیں بنتے رہتے ہیں۔

غیر پیداواری آبادی کا شدید دباؤ: پاکستان میں آبادی میں اضافے کی شرح دنیا کے دوسرے ممالک کے لحاظ سے کافی بلند ہے۔ مجموعی آبادی کے اعتبار سے پاکستان دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے۔ کم آمدنیوں والے 40 ممالک ملکوں کے گروپ میں یہ عوامی جمہوریہ چین، بھارت، اور بنگلہ دیش کے بعد چوتھے نمبر پر ہے۔ پاکستان کی آبادی میں 1.9 فیصد سالانہ کے لگ بھگ مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ 2004 گویا ہر سال آبادی میں 20 لاکھ افراد کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جبکہ معیشت میں اضافے کی سالانہ شرح 6.4 فیصد ہے۔ جو تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی نذر ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں معیشت حقیقی معاشی ترقی سے ہمکنار نہیں ہو رہی۔ آبادی کا یہ شدید دباؤ معیشت کو صرف مقداری طور پر بلکہ معیاری طور پر بھی مفلوج بنائے ہوئے ہے۔ معاشی سرگرمیوں میں عملی طور پر حصہ لینے والی آبادی کل آبادی کا 35 فیصد ہے۔

سرمایہ اندوزی کی پست شرح: پاکستان میں سرمایہ اندوزی کی شرح بہت ہی پست ہے۔ اس کی بڑی وجہ ملک میں بچتوں کی پست شرح ہے۔ بچتوں کی شرح خام گھریلو پیداوار کے تقریباً 20 فیصد تک ہے جو کہ ترقی یافتہ ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ترقی پزیر ملکوں سے بھی بہت کم ہے۔

ناموافق ادائیگیوں کا توازن: پاکستان کی ادائیگیوں کا توازن پانچویں عشرے کے ابتدائی دو برسوں کے علاوہ اب تک قطعاً ناموافق چلا آرہا ہے۔ اس بگڑتی ہوئی صورت کے ذمہ دار کئی عوامل ہیں۔ ان میں اہم ترین حامل معیشت کا زرعی کردار ہے۔ پاکستان کو بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہونے اور صنعتی شعبے کے ترقی پزیر حالت میں ہونے کی وجہ سے اپنی زرعی پیداوار کی برآمد کے عوض بڑی تعداد میں مختلف قسم کے اشیائے سرمایہ، اشیائے صرف اور تیل وغیرہ درآمد کرنا پڑتے ہیں۔ زرعی برآمدات کی قیمتیں بین الاقوامی منڈیوں میں یا تو مسلسل جوں کی توں چلی آرہی ہیں یا ان میں کمی ہوتی رہتی ہے جبکہ درآمدات کی قیمتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ جس کے نتیجے میں

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

ادائیگیوں کے توازن میں پیدا ہونے والا فرق ہر سال بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس فرق کو دور کرنے کیلئے پاکستان کو غیر ملکی قرضوں اور امداد کا سہارا لینا پڑ رہا ہے۔ قرضوں کا بوجھ بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت حد تک پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ اس بگڑتی ہوئی صورتحال نے معاشی ترقی کی رفتار کو بری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ اب تک پانچ سالہ منصوبوں میں کیا جا چکا ہے مگر تمام تر کوششوں کے باوجود ادائیگیوں کا توازن درست نہیں ہو رہا۔

معیشت کی انتظام کاری میں شدید بدنظمی: پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اس کے معاشی وسائل بڑے محدود ہیں مگر ان محدود وسائل سے بھی بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ وسائل کے استعمال میں تقریباً ہر شعبے میں بڑی بدنظمی پائی جاتی ہے۔ سرکاری تجزیے کے مطابق ہر سال تقریباً 40 بلین روپے کے وسائل محض انتظامی بدنظمی سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ قومی وسائل کا یہ زیاں ایک مجرمانہ نقصان ہے اور معیشت کا ہر شعبہ اپنی مؤثر کارکردگی دکھانے سے قاصر رہتا ہے۔ سرکاری محکمے اس مجرمانہ نقصان کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔ رشوت ستانی، فرائض سے مجرمانہ غفلت، اقربا پروری، اور سرخ فیتے کا اعلانیہ بے دریغ استعمال ان محکموں کی نمایاں خصوصیات بن چکے ہیں۔ ٹیکس چوری کو عام وباء کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے جس سے کالے دھن کی خوب حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ یہ کالا دھن ایک متوازی معیشت کی طرح کام کر رہا ہے جس سے حقیقی معیشت تقریباً مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔

غیر حقیقی اور سیاہ معیشت کی سرگرمی: پاکستان میں دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی طرح حقیقی معیشت کے ساتھ ساتھ غیر حقیقی اور کالے دھن کی معیشت بھی ایک متوازی معیشت کے طور پر سرگرم عمل ہیں۔ غیر حقیقی معیشت ان تمام کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں پر مشتمل ہے جن میں مال کی فروخت کی رسیدیں جاری نہیں کی جاتیں اور نہ ہی ان کا لین دین بینکوں کی معرفت ہوتا ہے۔ کالے دھن کی معیشت ان غیر قانونی سرگرمیوں پر مشتمل ہے جو کالے دھن سے سرانجام دی جاتی ہیں۔ ان سرگرمیوں میں اسمگلنگ، منشیات کی فروخت اور ذخیرہ اندوزی کر کے بھاری منافع کمانے جیسے کاروبار شامل ہیں۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق پاکستان میں ہر سال تقریباً 1000 بلین روپے کی مالیت کی اشیاء اسمگلنگ ہو کر آتی ہیں جو بازاروں میں کھلے عام بکتی ہیں اس سے قومی خزانے کو ہر سال تقریباً 50 بلین روپے کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

ترقی پذیر صنعتی شعبہ: ترقی یافتہ صنعتکاری کسی معیشت کی خاطر خواہ ترقی کیلئے بہت ضروری ہوتی ہے بدقسمتی سے پاکستان کا صنعتی شعبہ تقریباً آدھی صدی گزر جانے کے باوجود ترقی پذیر حالت میں ہے۔ اس کی اس حالت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ خام گھریلو پیداوار میں صنعتی شعبہ کا حصہ 26 فیصد کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ تقریباً 6 دہائیوں کی مسلسل کوششوں کے بعد ملک صرف کاٹن ٹیکسٹائل صنعت کی پیداوار میں خود کفیل ہو سکا ہے۔ سیمنٹ، شکر، کیمیائی کھاد، بناسپتی گھی، اور وولن ٹیکسٹائل کی صنعتیں ابھی تک ترقی پذیر حالت میں ہیں۔ لوہے فولاد، الیکٹرونکس اور الیکٹریکل جیسی بنیادی صنعتیں ابھی ابتدائی مراحل میں ہیں۔ جبکہ جدید ترین ٹیکنالوجی کی صنعتیں جن میں جینیاتی انجینئرنگ اور مائیکرو چپس کی صنعتیں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں کے قیام کا مرحلہ ابھی بہت دور دکھائی دیتا ہے۔

ترقی پذیر زرعی شعبہ: پاکستان کی معیشت اپنی بنیادی نوعیت اور کردار کے اعتبار سے ایک زرعی معیشت ہے اس لحاظ سے معاشی ترقی میں اس کا کردار بڑا اہم ہے۔ لیکن اس اہمیت کے باوجود معیشت کا یہ شعبہ اس حد تک ترقی یافتہ نہیں ہے کہ وہ معیشت کے دوسرے شعبوں کو ترقی دینے میں بھرپور مدد دے سکے۔ اس وقت زرعی شعبہ ترقی پذیر حالت میں ہے۔ گو یہ پسماندگی کے مرحلے سے نکل چکا ہے مگر ابھی یہ دوسرے ملکوں کے زرعی شعبوں کی طرح ترقی یافتہ نہیں بن سکا۔ اس کی بھی کئی وجوہات ہیں جن میں اہم ترین یہ ہیں۔ حقیت اراضی کا ناقص نظام، سیم وتھور اور زمین کے کٹاؤ کے مضر اثرات، جدید زرعی مشینری، کیمیاوی کھادوں اور فصلوں کے تحفظ کیلئے کیڑے مار دواؤں کا محدود استعمال، آبپاشی کی خاطر خواہ سہولتوں کی غیر موجودگی، حسب ضرورت زرعی قرضوں کی خاطر خواہ فراہمی نہ ہونا، وقتاً فوقتاً سیلابوں اور ٹڈی دل کا تباہی پھیلانا اور انتشار اراضی و ذیلی تقسیم وغیرہ۔ چنانچہ زرعی شعبے کی ترقی کیلئے جتنی کوششیں کی جاتی ہیں وہ بڑی حد تک ان وجوہات کی نذر ہو جاتی ہیں۔

بے روزگاری: بیروزگاری کا مسئلہ بھی معیشت کو درپیش اہم اور متاثر کن مسائل میں سے ایک ہے۔ کل آبادی کا تقریباً 70 فیصد انحصار براہ راست اور بالواسطہ اپنی گزر بسر کیلئے زراعت پر ہے جبکہ زرعی شعبہ ہر سال میں زیادہ سے زیادہ سات ماہ تک روزگار کے مواقع فراہم کر سکتا ہے۔ مجموعی آبادی کا صرف 30 فیصد معاشی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے۔ کیونکہ 40 فیصد سے زیادہ آبادی ایک سال سے 12 سال کی عمر کے بچوں پر مشتمل ہے اور ملک مخصوص مذہبی و معاشرتی روایات کی وجہ سے 50 فیصد عورتوں اور ساٹھ سال سے زائد عمر کے مرد معاشی سرگرمیوں میں عملاً حصہ نہیں لیتے۔ 30 فیصد معاشی طور پر سرگرم کل آبادی کے 5 فیصد کو مستور بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح گویا مجموعی آبادی کا صرف 35 فیصد عملاً کام کرتا ہے۔ اور 65 فیصد اس 35 فیصد پر انحصار کرتا ہے۔ یہ ایک بڑی ہی ناخوشگوار صورت حال ہے۔ بے روزگاری پیدا کرنے میں ہمارے ناقص نظام تعلیم کا بڑا ہاتھ ہے۔ ستم کی انتہا ہے کہ ملک میں ہر سال کثیر سرمائے سے ڈاکٹروں اور انجینئروں کی جو تھوڑی سی تعداد تیار ہوتی ہے وہ روزگار نہ ملنے کی وجہ سے ملک و قوم کی خدمت کرنے کے بجائے دوسرے ملکوں میں قسمت آزمائی کیلئے چلی جاتی ہے۔ آبادی کی بلند ترین شرح پیدائش بے روزگاری کے اس مسئلہ کی سنگینی میں اور بھی اضافہ

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

کرتی رہتی ہے۔

سیاسی عدم استحکام: 64 برس سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود ملک کو ابھی تک سیاسی استحکام نصیب نہیں ہو سکا۔ سیاستدانوں کی حماقتوں کی وجہ سے 20 برس کے لگ بھگ ملک میں مارشل لاء نافذ رہا۔ 10 برس کا عرصہ صدارتی نظام حکومت کے تجربے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ پہلے دو آئین ناکامی کی نذر ہو گئے۔ مشرقی پاکستان سیاستدانوں اور جرنیلوں کی خود غرضیوں کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے علیحدگی پر مجبور ہو گیا۔ 1973ء کے آئین میں وقت کے حکمرانوں نے اپنے مفادات کیلئے کچھ ایسی من مانی ترامیم کر دیں کہ دس برس کے عرصے میں 4 منتخب عوامی حکومتوں کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔ اس غیر یقینی سیاسی صورت حال سے ملک کو سب سے بڑا اور ناقابل تلافی نقصان یہ ہوا کہ غیر ملکی سرمایہ کاری برائے نام ہی ہو سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ملک جو چھٹی دہائی کے شروع میں ایشیاء کا صنعتی ٹائیگر بننے کے لئے ہاتھ پاؤں کھول رہا تھا نویں دہائی کے اختتام پر بھیگی بلی بن کر رہ گیا ہے۔ کوریا، تائیوان، ملائشیا، ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ جیسے ممالک جنہوں نے شروع میں اسے اپنے لئے مشعل راہ بنایا تھا اب اس کیلئے روشنی کا میار بن کر اسے راہ دکھا رہے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام نے ملک کی ترقی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ہوتا یہ چلا آ رہا ہے کہ چار پانچ برس پرامن رہنے کے بعد ملک میں جونہی صنعتی امن و امان پیدا ہونے لگتا ہے سیاسی ہنگامے اور گھیراؤ جلاؤ کی سیاست اس کا صفایا کر کے رکھ دیتی ہے۔ بدقسمتی سے فرقہ واریت، لسانیت اور صوبائیت پرستی جیسی بیماریوں نے سیاست کے میدان کو بری طرح گندہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر چھوٹی سیاسی جماعت ملک پر حکومت کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہے خواہ اس کیلئے ملک و قوم کو کتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ اس سیاسی کلچر نے معاشرتی ترقی کی توانائیوں کے سوتے تقریباً خشک کر دیئے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں انسانی وسائل کی ترقی کو ابھی تک کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ تعلیم جیسے اہم ترین شعبے پر قومی آمدنی کا زیادہ سے زیادہ 2 فیصد مخصوص کیا جاتا ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کے بارے میں کبھی سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ طبی سہولتوں کی فراہمی زیادہ تر شہری آبادی تک ہی محدود ہے۔ نظام تعلیم جدید دور کی حقیقی زندگی سے کس حد تک لاتعلق ہے اس کے بارے میں آج تک سنجیدگی سے کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔ شرح خواندگی دنیا بھر میں پست ترین ہے مگر اسے بڑھانے کی کسی کو کوئی فکر نہیں۔ چنانچہ یہ انسانی وسائل کی ترقی سے مجرمانہ غفلت کا ہی نتیجہ ہے کہ ملک کی آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ غیر پیداواری آبادی بتدریج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

قرضوں کے بوجھ میں ناقابل برداشت اضافہ: بڑے بڑے قرضوں کو حاصل کرنے کا مقصد کئی وجوہ کی بنا پر حاصل نہیں ہو سکا بلکہ قرضوں کے بوجھ میں ناقابل برداشت حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ 2003-2004 کے دوران بیرونی قرضوں کا بوجھ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ خام گھریلو پیداوار کا تقریباً 37.8 فیصد ان کے عوض رہن ہو کر رہ گیا ہے۔ غیر ملکی زرمبادلہ کا 18 فیصد صرف ملکی قرضوں کے عوض اس کے سود کی ادائیگی کی نذر ہو رہا ہے۔

❖☆❖

آبادی میں بلند شرح سے اضافے کے معیشت پاکستان پر اثرات و نتائج

پاکستان اپنے قیام سے ہی آبادی میں بلند شرح سے اضافے کے سنگین مسائل سے دوچار چلا آ رہا ہے۔ آبادی میں قیام پاکستان سے لیکر 2001ء کے اختتام پر 5 گنا کے لگ بھگ اضافہ ہو گیا ہے۔ 2007ء کے اختتام پر آبادی میں اضافے کی شرح کا تخمینہ 2.8 فیصد سالانہ لگایا گیا ہے۔ اگر اس شرح کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کی آبادی میں ہر سال 3.7 ملین افراد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ماہرین کی رائے میں اگر پاکستان کی آبادی میں اضافے کا یہی حال رہا تو یہ 2025ء تک چین اور بھارت کے بعد آبادی کے لحاظ سے دنیا کا تیسرا بڑا ملک بن جائیگا۔ پاکستان کی آبادی اضافے کی یہ خطرناک صورت حال ملک کی معاشی صورت حال پر متعدد برے اثرات مرتب کر رہی ہے۔ جن میں اہم ترین یہ ہیں۔

غربت کے بھیانک دائرے کی وسعت میں کمی واقع نہیں ہو رہی ہے: چونکہ معیشت وسائل پر انحصار کرتی ہے اور بے انتہا غربت، سرمایہ کا فقدان اور مزدوروں کی کثرت جیسے مسائل سے دوچار ہے اس لئے اس میں مسلسل غربت میں اضافہ کے امکانات زیادہ ہیں اور غربت کا بھیانک حلقہ اور اسکے پھیلاؤ میں تیزی سے قومی معیشت کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے اب تک آٹھ پنج سالہ منصوبے مکمل ہو چکے ہیں پھر بھی اب تک فی کس آمدنی 1999ء کے لحاظ سے صرف 480 ڈالر سالانہ تک محدود ہے۔ جو کچھ ترقیاتی کوششوں سے حاصل ہوا وہ بڑھتی ہوئی آبادی کی نذر ہو گیا ہے اور عوام کی اکثریت پست معیار زندگی سے دوچار ہے اس سلسلہ میں صحیح بات یہی ہے کہ ترقیاتی کاموں کے فائدے غربت کے بھیانک پھیلاؤ کی نذر ہو رہے ہیں۔ غریبوں کے بچے بھی زیادہ ہوتے ہیں جس سے مزید غربت بڑھتی ہے۔

معاشی ترقیاتی کوششوں پر برے اثرات: آبادی میں تیزی سے اضافہ کی وجہ سے معاشی ترقیاتی کوششوں پر حسب ذیل برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

۱۔ تیز رفتار آبادی کے اضافے نے موجودہ اور مستقبل میں متوقع کثیر مقداری صرف کیلئے سرمایہ کاری کی مقدار کے اندازے کو مشکل بنا دیا ہے۔ معاشی ترقی کا زیادہ تر انحصار بڑی تعداد میں سرمایہ کاری پر ہوتا ہے جو پاکستان کی بڑی محدود اور بڑھتی ہوئی آبادی کے زیر اثر مستقبل میں صرف کیلئے سرمایہ کاری کی شرح زوال پذیر ہے۔

۲۔ بڑھتی ہوئی آبادی ملک کے قدرتی وسائل پر بے جا بوجھ ہے خاص طور پر اس لئے بھی کہ ہمارے ملک میں لوگوں کی اکثریت اپنے روزگار کے لئے زراعت پر انحصار کرتی ہے۔ آبادی کے بے تحاشا بڑھنے سے زرعی اراضی کی ملکیت مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے اور کاشتکاری کیلئے غیر موزوں اور عدم پیداواری ثابت ہو رہی ہے۔

۳۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے یہ بات مشکل ہوتی جا رہی ہے کہ معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کے پیش نظر ایسی متناسب تبدیلیاں کی جا سکیں کہ معاشی ترقی کی رفتار میں تیزی آئے۔

۴۔ شہری آبادی میں اضافہ کے رجحان سے بہت سارے ایسے امکانات میں اضافہ ہو رہا ہے جو مستقل طور پر ماحول کو نقصان پہنچانے کے ذمہ دار ہونگے۔ اس کے علاوہ رہائش، پانی اور آمدورفت وغیرہ پر بھی اس کے برے اثرات مرتب ہونگے۔

فی کس آمدنی میں کمی کا رجحان: بڑھتی ہوئی آبادی سے فی کس آمدنی میں کمی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے جسکی چار وجوہات ہیں۔

۱۔ زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔

۲۔ اشیائے صرف کی لاگت میں اضافہ چونکہ ضروری اشیاء/اجناس میں کمی واقع ہو رہی ہے۔

۳۔ تشکیل سرمایہ میں کمی واقع ہو رہی ہے کیوں کہ خاندان کے اراکین میں اضافہ سے گھریلو اخراجات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

۴۔ قومی آمدنی میں جو اضافہ ہو رہا ہے وہ افزائش آبادی کی نذر ہوتا جا رہا ہے۔

معیار زندگی میں کمی کا رجحان: جیسے جیسے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے غذائی اجناس، رہائشی مکانات اور لباس وغیرہ کی طلب میں بھی اس حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ان چیزوں کی فراہمی میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ جس کی بہت ساری وجوہات ہیں مثلاً خام مال، سرمایہ اور تربیت یافتہ مزدوروں کی کمی۔ نتیجتاً ان کی لاگت اور قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس اضافہ سے معیار زندگی کو قائم رکھنے کے اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے اور ظاہر ہے اس سے لوگوں کے معیار زندگی کی پستی میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

زرعی ترقیاتی کوششوں میں کمی کا رجحان: زراعت کا شعبہ جو معیشت میں ایک اہم مقام کا حامل ہے اس پر بھی بڑھتی ہوئی آبادی کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ تقریباً مجموعی آبادی کا 70 فیصد حصہ دیہاتوں میں رہائش پزیر ہے جن کا بڑا پیشہ زراعت ہے۔ آبادی میں اضافہ کے باعث اراضی اور انسانی نفری کے درمیان پائے جانے والی نسبت بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ آبادی کا دباؤ اراضی پر بڑھ رہا ہے لیکن زمین کی فراہمی لچکدار ہوتی ہے اس لئے اس سے بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے، فی کس آمدنی میں کمی واقع ہو رہی ہے اور فی کس پیداواری صلاحیت کی شرح بھی کم ہو رہی ہے۔ بے زمین کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے ان کی مزدوری میں کمی واقع ہو رہی ہے فی کس پست پیداواری صلاحیت کی وجہ سے لوگوں کے بچت کرنے اور سرمایہ کاری کرنے کی صلاحیت میں بھی کمی واقع ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا استعمال زرعی اراضی پر نہیں ہو رہا ہے۔ جس وقت کی حقیقی ضرورت ہے۔ سرمایہ کی عدم تشکیل زرعی شعبہ کو بری طرح متاثر کر رہی ہے اور اجتماعی طور پر معیشت کمترین سطح تک پہنچ گئی ہے۔

روزگار میں کمی کا رجحان: تیزی سے آبادی میں اضافہ کی وجہ سے معشیت میں بڑے پیمانے پر بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آبادی میں اضافہ کرنے والوں اور کل آبادی کے باہمی تناسب میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اب چونکہ کوئی ضمنی وسائل دستیاب نہیں ہیں اس لئے نئی ملازمتوں کے مواقع پیدا نہیں ہوتے۔ مزدوروں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے اس قدر بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی سے لوگوں کی آمدنی اور بچتوں اور سرمایہ کاری میں کمی واقع ہوئی ہے جس سے تشکیل سرمایہ میں کمی ہو رہی ہے اور ملازمتوں کے مواقع بھی کم ہو رہے ہیں جس سے بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

معاشرتی بنیادی ڈھانچہ میں پسماندگی کا رجحان: تیزی سے آبادی میں اضافہ اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ بڑی مقدار میں معاشرتی بنیادی ڈھانچہ میں سرمایہ کاری کی جائے۔ اس کیلئے راست طور پر پیداواری اثاثوں سے وسائل کی منتقلی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ساری آبادی کو تعلیمی، صحت، طبی امداد، آمدورفت اور رہائش کی سہولیات دی جائیں۔ ان خدمات کی نوعیت میں بجائے بہتری کے رفتہ رفتہ خرابی پیدا ہو رہی ہے۔ اسکول جانے والے بچوں کی تعداد مزدوروں کی نفری میں بے تحاشہ اضافے سے تعلیمی اور تربیتی سہولتوں پر زبردست دباؤ بڑھ رہا ہے۔ جس سے تعلیم کے معیار اور نوعیت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اسی طرح ان باتوں سے آبادی کی صحت پر بھی برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

معیشت پر زیادہ بوجھ پڑنے کا رجحان: آبادی میں کثرت سے اضافہ کی وجہ سے 1 تا 15 سال کی عمر والے بچوں کا آبادی میں فیصد بڑھ رہا ہے جو معیشت پر اضافی بوجھ

رہے ہیں۔ اس صورت حال میں پیداواری صلاحیت اور آمدنی میں بھی زبردست کمی ہو رہی ہے اس لئے اجرتوں میں بھی اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور منافع اور لگان (کرایہ) میں اضافہ ہونے کے باوجود لوگوں کو اس کا فائدہ نہیں مل رہا ہے۔ جس سے آمدنیوں میں عدم مساوات جنم لے رہی ہے۔

تشکیل سرمایہ کاری میں کمی کار جحان: آبادی میں کثیر اضافہ سے تشکیل سرمایہ کاری میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ آبادی میں اضافہ سے فی کس آمدنی میں کمی ہو رہی ہے لوگوں کو اپنی محدود آمدنی میں اپنے بچوں کا پیٹ پالنا پڑ رہا ہے اس سے اشیاء صرف پر اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس سے بچت کی صلاحیت مفقود ہوتی جا رہی ہے اور مستقبل میں سرمایہ کاری میں بھی انحطاط ظہور پزیر ہونے کا امکان ہے۔ سرکاری بچتوں اور تشکیل سرمایہ میں بھی کمی واقع ہو رہی ہے اور یہ آبادی میں اضافے سے متاثر ہو رہے ہیں۔

ماحولیاتی نقصان کے امکانات: آبادی کی شرح میں غیر معمولی اضافہ سے ماحولیاتی نقصانات کے امکانات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اراضی کی کمی محسوس ہوتی ہے تو لوگ بڑی تعداد میں حساس علاقوں مثلاً پہاڑوں کے ڈھلان اور خطہ کنارہ کے جنگلات کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور پھر جنگلات کی بے تحاشہ کٹائی شروع ہو جاتی ہے تا کہ جنگلات کو صاف کر کے حاصل شدہ زمین پر کاشتکاری کی جائے۔ اس سے ماحولیاتی نقصانات واقع ہوتے ہیں اس کے علاوہ آبادی کے بڑھ جانے سے لوگوں کو زیادہ غذا اور مویشی وغیرہ کی ضرورت بھی پڑتی ہے اس لئے وہ نیم خشک علاقوں میں بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔ آبادی بڑھنے سے لوگ شہروں کے صنعتی علاقوں کی طرف روزگار کی تلاش میں ہجرت کرتے ہیں اس سے ہوا، پانی اور صوتی آلودگیاں پیدا ہوتی ہیں جس سے ماحولیاتی نظام بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

معیشت پاکستان کے زراعت کی اہمیت

جہاں تک زراعت کا تعلق ہے تو یہ پیشہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ زراعت اور اس سے متعلقہ دوسری شاخیں بنی نوع انسان کیلئے روزی کی فراہمی کے دروازے کھولتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا ملک استثنائی صورت کا حامل ہے۔ پاکستان کی معیشت میں زراعت کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ کل آبادی کا 70 فیصد براہ راست اور بالواسطہ زراعت سے وابستہ ہے۔ دیہی آبادی کا 75 فیصد کلی طور پر اس پر انحصار کئے ہوئے ہے۔ زمین کے تحفظ کیلئے ضروری اقدامات کو بھی پوری طرح بروئے کار نہیں لایا جاتا۔ ایک مستند تجزیئے کے مطابق مجموعی قابل کاشت رقبے کا ایک چوتھائی کے لگ بھگ مختلف درجوں تک کٹاؤ کے عمل سے متاثر ہو چکا ہے۔ کٹاؤ کے عمل کی ذمہ داری آندھیوں اور سیلابوں کی یلغار، جنگلات کی بقدر ضرورت غیر موجودگی یا ان کی حد سے زیادہ کٹائی اور چراگاہوں کی بے حد کمی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ زمین کی زرخیزی کے پوری طرح محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پیداواری صلاحیت متاثر ہوتی رہتی ہے۔

سیم وتھور کے اثرات: سیم وتھور کا مسئلہ اپنی سنگینی اور دور رس نتائج واثرات کی وجہ سے پاکستان کی معیشت کیلئے ایک زبردست چیلنج بنا ہوا ہے۔ پاکستان کی آب پانی کا مصنوعی نظام جہاں اپنی افادیت کے پیش نظر معیشت کیلئے بڑی اہمیت کا حامل ہے وہاں یہ اب سیم وتھور جیسے مسئلے کو جنم دینے کا باعث بن چکا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 1999ء کے اختتام تک 100 لاکھ ایکڑ اراضی سیم وتھور سے متاثر ہو کر اپنی پیداواری صلاحیتوں سے محروم ہو چکی ہے اور ہر سال 80 ہزار ایکڑ سے لیکر ایک لاکھ ایکڑ تک رقبہ مسلسل متاثر ہو رہا ہے۔ ملک کے زرخیز ترین خطے یعنی پنجاب بالائی سندھ اور زیریں سندھ کی زرخیز ترین زمینیں ان سے بری طرح متاثر ہو چکی ہیں۔

آب پاشی کی سہولتوں میں کمی: کل قابل کاشت رقبے کے دو تہائی حصے کے لئے آب پاشی کی سہولتیں حاصل ہیں جبکہ ایک تہائی حصہ آب پاشی کیلئے بارشوں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے اور بارشیں عموماً غیر یقینی ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بارشوں کا سالانہ اوسط بھی بہت کم ہے۔ بعض علاقوں میں صرف پانچ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔

انتشار اراضی اور ذیلی تقسیم: کل انتشار اراضی اور اراضی کی ذیلی تقسیم کے مسائل ایسے ہیں جن کی وجہ سے مشینی کاشت اور جدید سائنسی طریقوں سے فائدہ اٹھانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کل مزروعہ رقبے کا 35 فیصد ایک ایکٹر سے لیکر 12.95 ایکڑ کے قطعوں پر مشتمل ہے۔ جن پر محنت اور سرمائے کی کھپت سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔

غیر معاشی اور بکھرے ہوئے قطعات: غیر معاشی اور بکھرے ہوئے قطعات کا مسئلہ اگرچہ انتشار اراضی کے مسئلہ کا ہی ردعمل ہے لیکن اس کے اپنے جداگانہ اثرات ونتائج ہیں۔ اس مسئلہ کے تین محرکات ہیں۔

۱۔ زمین پر آبادی کے دباؤ میں اضافہ۔

۲۔ انفرادی طور پر ترجیحاً کاشت کرنا کار جحان۔

۷۔ فضول رسم و رواج کی دھن اور مقدمہ بازی کی لت۔

کیمیاوی کھادوں اور معیاری بیج کا کم استعمال: بہتر کاشت کے اصولوں کے تحت کیمیائی کھادوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے اور معیاری بیج استعمال کئے جائیں۔ پاکستان میں پیداواری اشیاء ضرورت کے مطابق استعمال نہیں کی جاتیں۔ گزشتہ چند سالوں سے حکومت کی اعانت اور حوصلہ افزائی سے ان کا استعمال بڑھنے لگا ہے مگر اب یہ اشیاء اس مقدار میں استعمال نہیں لائی جاتیں جس قدر کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں لائی جاتی ہے۔

سیلاب اور خشک سالی: پاکستان میں 40 فیصد زراعت کا انحصار آبپاشی کیلئے بارشوں پر ہے۔ جس سال بارشیں بروقت اور ضرورت کے مطابق ہوتی ہیں فصلیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن جس سال بارشیں ضرورت سے زیادہ ہو جائیں تو سیلاب آجاتے ہیں۔ جو شدید جانی و مالی نقصان کا باعث بنتے ہیں اور جس سال بارشیں کم ہوں خشک سالی گھیر لیتی ہے۔

کاشتکاری کے غیر معیاری طریقے: پاکستان میں 80 فیصد کاشتکاری کیلئے اب بھی صدیوں پرانے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جب کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں 80 فیصد کاشت کاری کیلئے جدید طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ غیر معیاری طریقوں کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار کا معیار پست رہتا ہے جس سے خود کسان ہی نہیں ملک و قوم بھی نقصان میں رہتے ہیں۔

زرعی پیداوار کی فروخت کی خامیاں: پاکستان میں منظم منڈیوں کی عدم موجودگی، ذرائع نقل و حمل کی سہولتوں کی کمی، زرعی قرضہ کی فراہمی کی سہولتوں کی کمی اور پیداوار مناسب وقت تک کیلئے اسٹور کرنے کے لئے گوداموں کی کمی وغیرہ کی وجہ سے کسانوں کو اپنی پیداوار فروخت کرنے اور ضروری اشیاء خریدنے کے سلسلے میں بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو انہیں اپنی خون پسینہ کی کمائی کا جائز حق بھی وصول نہیں ہو پاتا۔

نباتاتی امراض اور کیڑے مکوڑے: ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر سال فصلوں کا 10 سے 15 فیصد تک نباتاتی امراض اور کیڑے مکوڑے اور چوہوں وغیرہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس نقصان کو جراثیم کش دواؤں کے چھڑکنے سے روکا جا سکتا ہے مگر ہمارے کسانوں کی یا تو سادہ لوحی انہیں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے سے روکتی رہتی ہے اور یا ان کی مالی حالت انہیں اس سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھتی ہے۔

زرعی قرضوں کی سہولتوں کی کمی: پاکستان میں 80 فیصد کے لگ بھگ کسان مالی اعتبار سے اس حد تک تنگ دوست ہیں کہ انہیں اپنے کھیتوں میں ہل چلانے سے لیکر پیداوار کو منڈی تک پہنچانے کیلئے بھی مالی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ملک میں اگرچہ زرعی قرضوں کی فراہمی حکومت کی زرعی پالیسی کا ایک اہم حصہ بن چکی ہے مگر اب بھی کسانوں کی اکثریت کو آسان شرائط پر اور حسب ضرورت قرضہ حاصل کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کچھ سرکاری دفتروں کی رسمی کاروائیاں، کرپشن اور رشوت ستانی کی سرگرمیوں اور کچھ خود کسانوں کی سادگی اور سادہ لوحی بھی شامل ہے۔

زرعی معیشت کی قومی ترقی میں اہمیت: زرعی شعبہ معیشت پاکستان کا ایک اہم جزو ہے اور اسے معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بات کا ثبوت حسب ذیل حقائق کے مطالعہ سے ملتا ہے۔

۱۔ زرعی شعبہ نہ صرف معیشت کا سب سے اہم بڑا شعبہ ہے بلکہ سب شعبوں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ براہ راست یا بالواسطہ روزگار فراہم کرتا ہے جس سے آبادی کا 70 فیصد حصہ فائدہ اٹھاتا ہے اور مزدوروں کی نفری کے 42.1 فیصد حصے کو ملازمتیں فراہم کرتا ہے۔

۲۔ ایک حالیہ اندازہ 2003-2004 کے مطابق ملک کی خام گھریلو پیداوار کا 23.3 فیصد سالانہ حصہ زرعی شعبہ فراہم کرتا ہے اس لئے اگر خدانخواستہ اس شعبہ کی کارکردگی اور پیداواری صلاحیت کم ہو جائے تو اس سے ملکی معیشت پر بڑے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۳۔ پاکستان کی بیرونی تجارت کا دارومدار بڑی حد تک فاضل برآمدات پر ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ملک کتنی مقدار میں درآمدات اور خدمات حاصل کرنے کا اہل ہے۔ حال میں زرعی شعبہ نے برآمدی اشیاء کا 45 فیصد حصہ (خام اور تیار شدہ اشیاء) فراہم کرنا شروع کر دیا ہے۔

۴۔ کاروبار اور ترقی پزیر صنعتی شعبے اپنی ترقی کیلئے اس شعبہ پر انحصار کرتے ہیں۔ یہ زرعی پیداواریں ہوتی ہیں جن کے عوض قرضے، امداد، اشیاء اور خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ تاکہ دوسرے شعبوں کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔

۵۔ زرعی شعبہ نہ صرف لوگوں کی غذائی ضروریات کو پورا کرتا ہے بلکہ وہ ملک کی صنعتوں کیلئے خام مال فراہم کرتا ہے تاکہ ان میں ترقی اور وسعت ہو۔ ساتھ ہی کاروباری اور تجارتی شعبوں کیلئے بھی وہ ایسی ہی سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

6. زرعی شعبہ مختلف صنعتی پیداواروں کیلئے منڈی فراہم کرتا ہے مثلاً اس شعبہ میں حسب ذیل صنعتی اشیاء کی خریداری ہوتی ہے، زرعی مشینری، ٹریکٹر، ہارویسٹر، تھریشر، ٹل، ہسکر، ٹیوب ویلز، کیمیائی کھادیں، کیڑے مار ادویات وغیرہ۔ ان کے استعمال سے زرعی پیداواروں میں اضافہ ہوتا ہے۔

7. چونکہ زرعی شعبہ عوام کی آمدنی کا اہم شعبہ ہوتا ہے اس لئے اس سے عوام الناس کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ہر ملک جو اشیاء اور خدمات پیدا کرتا ہے انہیں برآمد کرتا ہے اور ان اشیاء کی درآمدات کرتا ہے جو اس ملک میں پیدا نہیں ہوتیں۔ پاکستان چونکہ ایک زرعی ملک ہے اس لئے پاکستان اپنی زرعی پیداواروں کو برآمد کرتا ہے یہ پیداوار ملکی برآمدات کا 45 فیصد ہیں اس طرح یہ شعبہ بڑی مقدار میں زرمبادلہ کماتا ہے جس کو ملک کیلئے درآمدی اشیاء اور خدمات خریدنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے اور اس کی وسعت پذیر صنعتی، کاروباری، تجارتی اور باربرداری کے شعبوں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے برآمدات کی مقدار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو صرف اسی صورت میں پوری ہوسکتی ہیں جب کہ زرعی اشیاء کی اور ان سے بننے والی اشیاء کی برآمدات میں اضافہ ہو۔

زرعی شعبہ چونکہ معیشت کا سب سے بڑا شعبہ ہے اس لئے یہ لوگوں کو روزگار فراہم کرتا ہے ان کی غذائی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے اور زندگی کی دوسری ضروریات کیلئے اشیاء درآمد کرنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ قریب قریب آبادی کا 68 فیصد حصہ دیہی علاقہ میں رہتا ہے اور 70 فیصد عوام اسی شعبہ سے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔

پاکستان کے خارجہ تعلقات

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات

پس منظر: جغرافیائی اعتبار سے امریکہ پاکستان کا پڑوسی ملک نہیں ہے لیکن سیاستدانوں نوکر شاہی اور فوجی جرنیلوں کے مفادات نے دونوں ممالک کو بہت قریب لا کھڑا کیا۔ 1949ء میں امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ وزیر اعظم نے 1950ء کے اواخر میں یہ دورہ کیا اپنے اس دورے میں انہوں نے پاکستان کو مغرب سے زیادہ قریب اور اسلام کو عیسائیت کے قریب تر ثابت کیا اور مقابلتاً اسے کمیونزم سے بعید قرار دیا اور اس بنیاد پر انہوں نے معاشی اور فوجی امداد مانگی۔ محمد علی بوگرہ جو پہلے پاکستان کے امریکہ میں سفیر تھے کے پاکستان کا وزیر اعظم بننے سے امریکہ کے ساتھ ایک اتحادی پالیسی کی داغ بیل پڑی اور 19 مئی 1954ء کو پاکستان نے امریکہ کے ساتھ باہمی دفاعی امداد کا معاہدہ کیا اس معاہدہ کے تحت امریکہ نے پاکستان کو فوجی ساز و سامان دینا شروع کیا اور افواج پاکستان کی تربیت شروع کی اس کے علاوہ 19 مئی 1954ء کو ہی پاکستان سیٹو (ساؤتھ ایسٹ ایشین ٹریٹی آرگنائزیشن) کا رکن بنا گیا 1955ء میں بغداد پیکٹ کا رکن بھی بن گیا جو بعد میں سینٹو (سینٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کہلایا۔

پاک امریکہ ابتدائی تعلقات: 1958ء میں جنرل ایوب کے فوجی انقلاب سے پاکستان اور زیادہ امریکہ نواز بن گیا پاکستان نے امریکہ سے ایک دوطرفہ معاہدہ کیا جس کے نتیجے میں پاکستان امریکہ کا عظیم اتحادی برائے ایشیاء بن گیا۔ ان امریکہ نواز پالیسیوں کی وجہ سے پاکستان نے روس کی مخاصمت مول لی۔ کچھ عرب ممالک بھی پاکستان کی امریکی دوستی کو شبہ کی نظرے سے دیکھنے لگے اور اس پر مغربی ممالک کا کیمپ بن جانے کا اعلانیہ لیبل چسپاں کر دیا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں امریکہ نے غیر دوستانہ اور غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔ 1969ء میں نکسن امریکہ کے صدر منتخب ہوئے تو پاک امریکی تعلقات میں بہتری شروع ہوئی ان کے عہد صدارت میں پاک امریکی تعلقات کی ایک اچھی بنیاد رکھی گئی۔

1979 تا 2001: دسمبر 1979ء میں روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئیں جس سے روسی اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع ہوگیا اور اس علاقے میں امریکی مفادات کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس صورتحال میں صدر کارٹر نے پاکستان کی مدد پر لگائی گئی پابندی اٹھالی تاکہ دوبارہ اس خطے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائے اور اس کے لئے یہ بہانہ تراشہ کہ وہ اس امداد کے ذریعے پاکستان کی مدد کے خواہاں ہیں تاکہ پاکستان روسی توسیع پسندی کے خلاف اپنی حفاظت کر سکے۔ امریکہ نے یہ پروپیگنڈہ کہ پاکستان ایک فرنٹ لائن مملکت ہے اور یہ روس کا دوسرا ہدف ہوگا۔ اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے صدر کارٹر نے جنوری 1980ء میں 400 ملین ڈالر کا ایک معاشی اور فوجی امدادی پیکج پاکستان کے لئے منظور کیا۔

امریکہ نے دفاعی امور کے علاوہ تجارتی اور معاشی امور کے حوالے سے بھی حتی الامکان پاکستان کو زیر دباؤ رکھا جس کے باعث پاکستان میں ٹیکسٹائل اور کھیل کے سامان کی صنعت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی امریکہ نے CTBT کمپری ہنسو (جامع) ٹیسٹ بین ٹریٹی کے معاملے میں بھی پاکستان پر بے جا اور یکطرفہ دباؤ ڈالے رکھا کیونکہ بھارت نے CTBT پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور پاکستان کا موقف یہ تھا کہ جب تک بھارت اس معاہدے پر دستخط نہیں کرتا پاکستان بھی نہیں کریگا۔

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں سردمہری بلکہ انتقامانہ روش کا یہ باب جو 1989ء میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد شروع ہوا اس وقت زیادہ شدید نوعیت اختیار کر گیا جب مئی 1998ء میں جنوبی ایشیا میں ایٹمی توازن قائم کرنے کی ضرورت پیش ہوئی۔ 11 مئی 1998ء کو بھارت نے راجھستان کے علاقے میں پانچ زیرِ زمین ایٹمی دھماکے کئے جنہوں نے خطے کی سلامتی اور طاقت کے توازن کو خطرناک حد تک بگاڑ کر رکھ دیا اس کے جواب میں پاکستان نے 28 مئی 1998ء کو جواباً چھ زیرِ زمین ایٹمی دھماکے کئے۔ عمل اور ردِ عمل کی اس دوڑ کے نتیجے میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات بگاڑ کی انتہائی سطح تک آ گئے کیونکہ ان دھماکوں کے بعد امریکہ نے پاکستان کی ہر قسم کی امداد پر پابندیاں عائد کر دیں امریکہ نے نہ صرف دفاعی، معاشی اور تجارتی بلکہ تعلیم کے میدان میں بھی پاکستان پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ امریکہ کے زیر اثر جاپان، اور یورپ نے بھی اسی عمل کو دہرایا جس کے نتیجے میں پاکستان کیلئے شدید نوعیت کے معاشی مسائل پیدا ہو گئے کیونکہ امریکہ پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے بلکہ پاکستان کی سب سے زیادہ برآمدات امریکہ ہی جاتی ہیں۔ امریکہ 1988ء سے آج تک مختلف شعبوں میں تقریباً 2.7 بلین امریکی ڈالر کی براہِ راست سرمایہ کاری پاکستان میں کر چکا ہے۔

بعد از سرد جنگ کے دور میں امریکہ کی سردمہری اور انتقامانہ پالیسی کے باعث پاکستان دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا اور 1988ء سے 2001ء تک یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پاکستان کی کوئی خارجہ پالیسی ہی نہیں ہے کیونکہ امریکہ سے خراب تعلقات کے نتیجے میں پاکستان کا بین الاقوامی سیاست میں کردار بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

2001ء پاکستان کے جغرافیائی محلِ وقوع نے ہمیشہ سے پاک امریکہ تعلقات کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاک امریکہ تعلقات میں حالیہ تبدیلی 11 ستمبر 2001ء کے بعد سے شروع ہوئی ہے لیکن یہ دور انتہائی مختصر اور عبوری نوعیت کا دور ہے۔ امریکہ کی چوہدراہٹ اور غیر منصفانہ پالیسیوں کو نتیجہ 11 ستمبر 2001ء کو ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گون کی عمارتوں پر دہشت گردوں کے خودکش حملے کی صورت میں نکلا جس میں پانچ ہزار کے قریب لوگ مارے گئے۔ یہ حملے امریکی انا اور طاقت کے لئے سب سے بڑا چیلنج تھے۔ جس کا مقابلہ کرنے کیلئے امریکہ نے نہ صرف دنیا کے بیشتر ممالک کی حمایت حاصل کی بلکہ پاکستان کو دوست یا دشمن کی دھمکی دے کر اسے اپنے کیمپ میں پھر سے فرنٹ لائن اسٹیٹ کے طور پر شامل کر لیا کیونکہ دہشت گردی کی ذمہ داری القاعدہ نامی تنظیم پر ڈالی جس کا نیٹ ورک اور سربراہ اسامہ بن لادن افغانستان میں موجود تھا۔ افغانستان کے اندرونی معاملات اور طالبان حکومت پر پاکستان کے اثر ورسوخ اور افغانستان کے ساتھ پاکستان کے جغرافیائی، سیاسی اور انٹیلی جنس کے روابط کو امریکہ نے براہِ راست استعمال کیا۔ جیکب آباد، پسنی اور گوادر وغیرہ میں امریکہ کو اڈے دیئے گئے۔ امریکہ نے ازبکستان اور پاکستان کو اسٹیشن بنا کر افغانستان پر زبردست بمباری شروع کی۔

17 اکتوبر 2001ء کو شروع ہونے والی اس شدید بمباری اور ہر قسم کی بیرونی امداد سے محرومی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مہینے سے زیادہ طالبان افغانستان پر اپنا کنٹرول نہیں رکھ سکے اور انہوں نے شمالی اتحاد یا امریکیوں سے دوبدو مقابلے سے قبل ہی شکست تسلیم کر لی۔ 13 نومبر 2001 کو کابل پر شمالی اتحاد نے بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا جس کے بعد امریکہ برطانیہ اور دیگر ممالک کی افواج براہِ راست افغانستان میں اترنے کے قابل ہو گئی۔ امریکہ نے اس بار پاکستان سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد پہلے کی طرح پاکستان کو تنہا نہیں چھوڑے گا اور پاکستان کے تعاون کے بدلے امریکہ نے پاکستان پر لگائی گئی تمام سابقہ پابندیاں اٹھا لیں۔ پاکستان کے قرضے معاف کرنے سے ہر ملک نے انکار کر دیا ہے قرضوں کی ری شیڈولنگ اور چند ملین ڈالے کے مزید قرضوں کے وعدے کئے گئے ہیں کابل پر شمالی اتحاد کے قبضے کے بعد پاکستان کیلئے دفاعی صورتحال انتہائی نازک موڑ اختیار کر گئی ہے کیونکہ شمالی اتحاد ایران اور بھارت کے ساتھ مل کر خطے میں جو بلاک بنانے کا خواہاں ہے۔ پاکستانی صدر جنرل پرویز مشرف نے نومبر 2001ء میں امریکہ کا دورہ کیا جس کے دوران ہی افغانستان کی داخلی صورتحال پاکستان مخالف صورتحال میں تبدیل ہو گئی۔ امریکہ اب افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کا خواہاں ہے۔

پاکستان اور روس کے تعلقات

سرکاری طور پر سویت یونین کی 26 دسمبر 1991ء کو تقسیم عمل میں آئی جس کے نتیجے میں 15 آزاد اقتدار اعلیٰ کی حامل جمہوریائیں وجود میں آئیں ان جمہوریاؤں میں روس سب سے بڑی جمہوریہ ہے اور خود کو سویت یونین کے جانشین ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ پاکستان جس کے سویت یونین سے گزشتہ چار دہائیوں سے تعلقات قائم تھے وہ خود کو اس نئی بننے والی جمہوریہ سے قدرتی طور پر علیحدہ نہیں رکھ سکتا اس ضمن میں دوطرفہ تعلقات کے قیام کی دونوں ممالک کی طرف سے کوشش شروع ہوئی۔ روسی جمہوریہ کے قیام کے فوراً بعد نومبر 1991ء میں وزیر مملکت برائے خزانہ سردار آصف علی نے ماسکو کا دورہ کیا جس کے بعد انہوں نے وسطی ایشیا کا مشہور دورہ کیا۔ یہ وزارتی سطح پر پاکستان کی طرف سے روس کا کئی سال کی پچھلی حکومتوں کی غفلت کے بعد پہلا دورہ تھا جس سے روس اور پاکستان کے درمیان تعلقات کا نیا باب شروع ہوا۔ اس کے بعد کئی اعلیٰ سطحی وفود کے تبادلے ہوئے جو فریقین کے درمیان ابھی تک جاری ہیں۔ ان دوروں میں باہمی دلچسپی کے امور میں تعاون کے علاوہ دفاعی میدان میں

Lecturer Shaikh Asif Zahoori

تعاون، خلاء، ٹیکنالوجی اور ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال جیسے مسائل پر بھی بات چیت کی گئی۔ ان دوطرفہ دوروں کے تبادلے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روسی پاکستان سے اپنے
تعلقات بڑھانا چاہتے تھے کیونکہ یہ روسی پالیسی کی اس عام روش سے مختلف تھی جس میں پاکستان کو ایک مخالف ملک سمجھا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی عندیئے ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان اس بات کا خواہش مند ہے کہ روس سے دوطرفہ بنیادوں پر تمام قسم کے تعاون پر مبنی تعلقات استوار
ہوں۔ پاکستان نے روسی بیانات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کہ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ جنوبی ایشیاء کے لئے متوازن رویہ اپنانے کا خواہشمند ہے جب کہ ماسکو اپنے روایتی
قریبی تعاون کو نئی دہلی سے قائم رکھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اگرچہ روس پاکستان سے تعلقات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستان سے خصوصی تعلقات کا خواہش مند نہ تھا تب
بھی ہندوستان اس تبدیلی سے خوش نہ تھا لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد ماسکو کی نظروں میں ہندوستان کی فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے کوئی زیادہ اہمیت
باقی نہیں رہی تھی اور ماسکو کے چین سے تعلقات دوبارہ استوار ہو گئے تھے ہندوستان کو اس وقت مایوسی ہوئی جب روسی صدر بورس یلسن نے جولائی 1994ء میں ہندوستان
کے وزیراعظم نرسمہا راؤ کے ماسکو کے دورے میں کشمیر کے بارے میں کوئی پاکستان مخالف بیان نہیں دیا راؤ صاحب روسی صدر سے کوئی یقین دہانی حاصل کرنے میں بھی
کامیاب نہ ہوسکے کہ ماسکو پاکستان کو کوئی ہتھیار فروخت نہیں کرے گا۔
روس نے پاکستان سے اپنے افغانستان میں مقید جنگی قیدیوں کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا جن کے بارے میں وہ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر مجاہدین سے تعاون کرنے کا
مطالبہ کر رہا تھا۔ مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں وزیر خارجہ پاکستان دو روسی جنگی قیدیوں کو افغانستان سے رہا کروانے میں کامیاب ہو گئے اس دونوں کو وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے

روس کے اول نائب وزیر خارجہ اڈامیشین کے حوالہ اس وقت کیا جب وہ مئی 1994ء میں پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔ روسیوں نے پاکستانی کردار کو قدر کی نظر سے دیکھا
جو وہ سابقہ سوویت یونین کے افغانستان میں موجود جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے کر رہا تھا۔
جولائی 1994ء میں پاکستانی وزیر خارجہ کے روسی دورے میں ایک پروٹوکال پر دستخط کئے گئے جس کی رو سے یہ طے پایا کہ دونوں ممالک وزراء خارجہ کی سطح پر باضابطہ مشورے
کریں گے اور ساتھ ہی ڈپلومیٹک پاسپورٹ رکھنے والوں پر سے ویزا کی پابندی ختم کردینے کا معاہدہ بھی طے پایا ان دونوں معاہدوں پر دستخط سے یہ بات واضح ہوگئی کہ پاک
روس تعلقات سرد جنگ کے دوران پائے جانے والے مخاصمانہ رویہ کے مقابلہ میں بہت دوستانہ ہو گئے ہیں۔
24 ستمبر 1999ء کو روسی پارلیمانی وفد کے سربراہ الگزینڈر رویکر ووسکی نے اپنے دورے میں پاکستان کو فوجی ہارڈ ویئر فراہم کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ انہوں نے کہا کہ
روسی ٹیکنالوجی مختلف شعبوں میں پاکستانی منڈی حاصل کرسکتی ہے۔
1979ء میں افغانستان میں روسی فوجی مداخلت سے علاقائی جغرافیائی سیاسی حالات مکمل طور پر تبدیل ہو گئے افغانستان میں سوویت یونین کے ملوث ہونے سے پاکستان
کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ افغان عوام الناس کے خلاف مظالم کے نتیجہ میں تین لاکھ افغان ملک سے ہجرت کر کے پاکستان میں داخل ہو گئے اس کے علاوہ 15 لاکھ افغان
مہاجرین ایران میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ پناہ گزینوں کے اس زبردست ریلے سے پاکستان کے لئے کئی مالیاتی اور انتظامی مسائل پیدا ہو گئے۔ مجاہدین کی فراہم کردہ
اطلاعات کے مطابق نوسالہ جنگ میں 10 لاکھ سے ہوئی۔ اکثر پاکستانی مبصرین نے اس کو پاکستان کے لئے ایک تاریخی موقع قرار دیا اور وہ ان ممالک کے ساتھ سیاسی اور
معاشی تعلقات کے قیام کے سلسلہ میں امکانات جائزہ لینے میں دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں وہ یہ بنی کر رہے ہیں کہ حالیہ دور میں قائم ہونے والی اقتصادی تعاون کی تنظیم
(ECO) جن میں حسب ذیل ممالک شامل ہیں وسط ایشیاء کے چھ مسلم جمہوریتیں پاکستان، افغانستان، ایران اور ترکی بالآخر ایک علاقائی تعاون کا ایک گروپ بن جائیں
گے جن کے مابین سیاسی اور فوجی حکمت عملی کے سلسلہ میں بڑے پیمانے پر تعاون ممکن ہوگا۔

پاکستان اور افغانستان کے تعلقات

پاکستان اور افغانستان دو پڑوسی ممالک ہیں جن کے درمیان ماسوا چند سالوں کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ اس دونوں ممالک کے تعلقات مندرجہ ذیل عوامل کی وجہ سے کشیدہ رہے ہیں۔

افغانستان صوبہ سرحد کے کچھ حصہ پر اپنا حق جتاتا رہا ہے اور اس نے ڈیورنڈ لائن کے معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے یہ مطالبہ کیا کہ پاکستان میں پشتو بولنے والے علاقوں کو افغانستان میں شامل کر دیا جائے۔

افغانستان نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی شمولیت کی مخالفت کی اور وہ دنیا کا واحد ملک تھا جس نے پاکستان کے خلاف ووٹ دیا۔

افغانستان نے ہندوستان اور سوویت یونین کی مدد سے پاکستانی قبائل مرکزی حکومت پاکستان کے خلاف بغاوت پر اکسایا۔

1948ء میں پختونستان کی سرگرمیوں میں افغانستان نے مالی مدد فراہم کی اس کی وجہ سے دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی جس کے نتیجے میں 1949ء میں آزاد پختونستان کے قیام کا مطالبہ کیا جس کی علاقائی حدود مغرب میں ڈیورنڈ لائن مشرق میں دریائے جہلم شمال میں چترال اور جنوب میں کوئٹہ تھی لیکن پھر بھی افغانستان کے خشکی سے گھرے ہوئے محل وقوع کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان نے بڑی فراخدلی سے کابل کو کراچی کی بندرگاہ کے ذریعہ درآمدات اور برآمدات کرنے کی تجارتی سہولتیں فراہم کیں۔ جب سردار محمد داؤد ستمبر 1953ء میں افغانستان کے وزیراعظم بنے تو دونوں ممالک کے درمیان بہتر تعلقات قائم ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہی کیوں کہ انہوں نے پاکستان کے ساتھ بڑا سخت رویہ اختیار کیا۔

فروری 1967ء میں شاہ ظاہر شاہ نے پاکستان کا دوستانہ دورہ کیا جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں بہتری شروع ہوئی اس کے نتیجے میں افغانستان نے پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت بند کردی خاص کر جب 1971ء میں مشرقی پاکستان میں جنگ ہورہی تھی اور ہندوستان کی عملی طور پر فوجی مداخلت سے بنگلا دیش کا قیام عمل میں آیا۔ بھٹو جب پاکستان کے صدر بنے تو انوں نے سب سے پہلے فروری 1972ء میں کابل کا دورہ کیا۔ لیکن جب 1973ء میں شاہ ظاہر شاہ کو معزول کردیا گیا تو اس بہتری میں رکاوٹ پیدا ہوگئی اور سردار داؤد نے افغانستان کی حکومت پر قبضہ کرلیا اور کابل ریڈیو نے ایک بار پھر پاکستان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا شروع کردیا اور پھر دونوں ممالک کے تعلقات خراب ہوگئے۔

گیارہ ستمبر 2001ء تک پاکستان افغانستان کا سب سے بڑا دوست تھا تاہم گیارہ ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سینڑ اور پینٹا گون پر ہونے والی دہشت گردی کا زمہ دار جب افغانستان میں موجود اسامہ بن لادن کو ٹھہرایا گیا تو پاکستان زیادہ افغان ہلاک ہوئے جن کو کابل کی افواج نے سویت یونین کی مدد سے قتل کیا۔

پاکستان نے افغان مجاہدین کی بھرپور مدد کی تاکہ وہ اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جنگ لڑ سکیں۔ صدر ضیاء الحق نے افغان جدوجہد آزادی کو پاکستان کا اپنا مسئلہ ملک سمجھا کیوں کہ آج اگر افغانستان اس صورت حال سے وہ چار ہے تو کل پاکستان بھی اسی حالت سے دوچار ہوجائے گا۔ پاکستان نے واضح طور پر یہ موقف اختیار کیا کہ افغانستان سے معمول کے مطابق تعلقات صرف اسی وقت قائم ہوسکتے ہیں جب تک غیر ملکی افواج اس ملک سے نہیں چلی جاتیں اور افغانستان کی غیر جانبدار اور اسلامی حیثیت بحال نہیں ہوجاتی۔

پاکستان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ افغان لیڈروں پر منحصر ہے کہ وہ افغانستان میں ایک ایسے سیاسی طریقہ کا کے لئے اقدامات کریں جس سے اس ملک میں امن آشتی اتحاد اور قومی یکجہتی قائم ہو۔ افغانستان کے بارے میں پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ وہ اس ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا اور اب یہ افغان لیڈروں کو فیصلہ کرنا چاہئے کہ انہیں اپنے ملک کے مفاد میں آئندہ کیا اقدامات کرنے چاہئے۔

طالبان کے افغانستان کے سیاسی افق پر نمودار ہونے سے افغان مجاہدین اور سیاسی بصرین کو تعجب ہوا۔ طالبان افغان جنگجو نوجوانوں کی ایک جماعت ہے جس کی پچھلی کوئی تاریخ موجود نہیں یہاں تک کہ جن دنوں سویت یونین کے ساتھ لڑائی جاری تھی اس وقت بھی طالبان کا نام کسی نے نہیں سنا تھا۔ ستمبر 1994ء میں طالبان نے حکومتی فوج کو مختلف علاقوں میں شکست فاش دی اور تھوڑے عرصہ میں افغانستان کے بیشتر حصے پر قبضہ کرلیا۔ طالبان دینی مدرسوں کے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جنہوں نے ان دینی مدارس سے تعلیم حاصل کی ہے جو افغانستان اور پاکستان میں قائم ہیں۔

پاکستان کا ایک پڑوسی ہونے کے لحاظ سے ملکی مفاد اس بات میں ہے کہ افغانستان میں اتحاد کی فضاء پیدا ہو اور خانہ جنگی کا خاتمہ ہوجائے۔ یہ بات خود افغان عوام کے لئے بھی ان کا سب بڑا مقصد ہے اور صرف افغانستان میں امن کے ذریعے پاکستان اور ایران پر افغان پناہ گزینوں کا بوجھ کم ہوسکتا ہے۔ مزید جب تک افغانستان کی سرزمین سے رالداری کی سہولت حاصل نہیں ہوجاتی وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں سے پاکستان کے تعاون کی راہیں مسدود رہیں گی۔ بون (جرمنی) کانفرنس میں افغانستان کیلئے عبوری حکومت کا قیام کیا گیا جس کا سربراہ حامد کرزئی کو بنایا گیا ہے افغنستان میں امریکی اور برطانوی فوجیں اتر چکی ہیں اور عبوری حکومت مختلف نسلی گروہوں کا غیر متوازن مجموعہ ہے۔

پاکستان اور ایران کے تعلقات

پاکستان کی ایران کے ساتھ دوستی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ایران وہ پہلا اسلامی ملک تھا جس نے آزادی کے بعد پاکستان کو تسلیم کیا اور مرحوم شہنشاہ ایران پہلے سربراہ مملکت تھے جنہوں نے 1950ء میں پاکستان کا دورہ کیا اور اس کے جواب میں پاکستان کے صدر مملکت ایوب خان نے ایران کا دورہ کیا۔

ایران نے پاکستان کی ہر ضرورت کے وقت مدد کی ہے خاص طور پر 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں کے دوران ایران نے پاکستان کی مدد کی۔ پاکستان میں

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

لیکچرار: شیخ آصف اقبال ظہوری

قائم ہونے والی ہر حکومت نے ایران سے اچھے تعلقات قائم رکھنے اور ان تعلقات میں اضافہ ہو رہا ہے۔
پاکستان نے ایران عراق جنگ میں غیر جانبداری کا اظہار کیا کیوں کہ وہ امہ امن کمیٹی کا رکن تھا پاکستان نے عملی طور پر کوشش کی کہ خلیج کی جنگ رک جائے۔
13 نومبر 2001ء کو افغانستان کی داخلی سیاسی تبدیلی نے پورے خطے کی ریاست پر براہ راست اثرات مرتب کئے۔ افغانستان میں شمالی اتحاد کے غلبے کے بعد ایران اور
بھارت ملکر شمالی اتحاد کے ساتھ ایک بلاک بنا چکے ہیں جس کے نتیجے میں خطے کی سیاست خاصی پیچیدہ ہوگئی ہے۔ اس وقت پاک ایران تعلقات میں خلوص کے بجائے
شک کا عنصر زیادہ غالب ہے۔

پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات

پاکستانی عوام کے سعودی عرب کے ساتھ روحانی اور محبت کے قریبی رشتے قائم ہیں اور یہ روحانی رغبت دوطرفہ اچھے تعلقات کی بنیاد ہے۔ دونوں ممالک نے پاکستان کی
آزادی کے بعد سفارتی تعلقات قائم کر لئے اور 1951ء میں ایک "معاہدہ دوستی" پر دستخط کئے۔ 1954ء میں سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سعود نے پاکستان کا دورہ کیا
اس دورہ میں انہوں نے پاکستانی عوام کی سعودی عرب کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبات کو دیکھا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ کراچی سے قریب پناہ گزینوں کی ایک آبادی کا نا
سعود آباد رکھا گیا۔ جس سے شاہ سعود کے لئے پاکستانی عوام کی محبت کے جذبات اور سعودی فرمانروا کے لئے عزت واحترام کا مظاہرہ ہوا۔
سعودی عرب کو پاکستان کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں خاص دلچسپی ہے۔ 1954ء میں سعودی عرب نے پاکستان اور افغانستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم
کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ 1960ء میں صدر مملکت ایوب خان نے سعودی عرب کا دورہ کیا جس سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں مضبوطی پیدا ہوئی۔
1964ء میں جب سعودی عرب نے نہر سوئز کے مسئلہ پر فرانس اور برطانیہ سے سفارتی تعلقات منقطع کر لئے تو پاکستان نے فرانس اور برطانیہ میں سعودی عرب کے مفادات
کی نگرانی کی۔
1965ء میں شاہ فیصل سعودی عرب کے فرمانروا بنے تو دونوں ممالک کے تعلقات میں مزید مضبوطی پیدا ہوئی۔ انہوں نے کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کی
زوردار حمایت کا اعلان کیا اور ساری اسلامی دنیا سے اپیل کی کہ وہ اس مسئلہ پر پاکستان کی حمایت کریں۔ 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں میں سعودی عرب نے
پاکستان کی مدد کی اور جب سقوط ڈھاکہ ہوا تو شاہ فیصل رو پڑے۔ انہوں نے پاکستان کے تعاون سے 1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد کیا اور مرحوم
وزیراعظم بھٹو کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کیا تا کہ یہ کانفرنس کامیاب ہو۔ شاہ فیصل کی حکومت کے دوران پاکستان کو سعودی عرب نے ایک بلین روپیہ کا بلاسودی قرضہ دیا اس کے
علاوہ میرپور ماتھیلو کی کھاد کی فیکٹری کے قیام کے لئے بھی سرمایہ فراہم کیا۔
شاہ فیصل کے قتل کے بعد شاہ خالد برسراقتدار آئے انہوں نے 1967ء میں پاکستان کا دورہ کیا اس دورہ کے نتیجے میں دونوں ملکوں کے اشتراک سے ایک بینک "بینک آف
الجزیرہ" کا قیام عمل میں آیا اس بینک نے پاکستان کی مالی امداد میں گرانقدر حصہ لیا۔ شاہ خالد نے 1977ء میں پاکستان کے سیاسی بحران کو حل کرنے میں خاص دلچسپی لی اور
اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے جولائی 1977ء میں جنرل ضیاء نے فوج کی مدد سے بھٹو کی حکومت کے معزول کر دیا۔ جنرل ضیاء نے اپریل
1978ء، دسمبر 1979ء اور نومبر 1989ء کو سعودی عرب کا دورہ کیا اس کے علاوہ وہ متعدد بار آتے جاتے ہوئے اور غیر سرکاری دوروں پر سعودی عرب گئے۔
اپریل 1984ء میں سعودی ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز پاکستان کے چار روزہ دورے پر آئے انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ پاکستان اور سعودی عرب کے
تعلقات کی بنیاد اسلام اور اسلامی برادری ہے۔ پاکستان نے ہر موقع پر یہ ثابت کیا کہ وہ ایک اسلامی ملک ہے قرآن اس کا دستور ہے اور مسلم ہونے کی وجہ سے اس نے ہر
ضرورت کے وقت اسلامی ممالک کا ساتھ دیا۔ جنوری 1985ء میں دونوں ملکوں نے سیمینار نمائشیں اور دوسرے ایسے طریقے اختیار کرنے پر رضامندی ظاہر کی جن سے باہمی
تعلقات کو فروغ حاصل ہو۔ اس معاہدہ کے تحت یونیورسٹیوں کے اساتذہ، کھلاڑیوں اور اسکاؤٹس کے تبادلے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا۔
وزیراعظم نواز شریف ستمبر 1992ء کو جدہ پہنچے جہاں شاہ فہد نے ان کا استقبال کیا انہوں نے بوسنیا ہرزیگووینا، افغانستان اور کشمیر کے حالات حاضرہ کا جائزہ لیا دونوں
رہنماؤں نے ان اہم امور پر مشترکہ خیالات کا اظہار کیا۔ شاہ فہد نے کہا کہ دونوں ممالک کے تعلقات کی جڑیں بڑی گہری ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ نواز شریف میرے بھائی جیسے
ہیں اور انہوں نے دعا کی کہ نواز شریف پاکستان کو معاشی طور پر ترقی یافتہ اور خوش حال بنانے کے مقصد میں کامیاب ہوں۔
مئی 1999ء میں سابق وزیراعظم نواز شریف نے سعودی عرب کا سرکاری دورہ کیا۔ اکتوبر 1999ء میں چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے سعودی عرب کا دورہ کیا اس
کے بعد جون 2000ء اور مارچ 2001ء میں جنرل پرویز مشرف سعودی عرب کے لگاتار دورے کئے جن میں دونوں ممالک کے باہمی تعلقات اور تعاون کی جہت کو وسیع

LecturerShaikhZahoorIQBAL

کرنے امکانات پر غور کیا گیا۔ پاکستان اور سعودی عرب کے مشترکہ معاشی کمیشن کا چھٹا اجلاس ریاض میں جنوری 2001ء میں ہوا جس میں دونوں ممالک کے درمیان معاشی اور تجارتی تعلقات کے مزید فروغ کے لیے کئی اہم فیصلے کئے گئے۔ 11 ستمبر 2001ء میں امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی کے نتیجے میں افغانستان پر حملے سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس میں سعودی عرب نے خاصی محتاط پالیسی کا مظاہرہ کیا۔

آج کل سعودی عرب اور پاکستان کے تعلقات مثالی نوعیت کے حامل ہیں اور ان کی بنیاد برادرانہ تعلقات پر قائم ہے دونوں ممالک نے طلباء کو ایک دوسرے کی یونیورسٹی تک سہولتیں فراہم رکھی ہیں اور سینکڑوں سعودی کیڈٹ پاکستان کی ڈیفنس اکیڈمیوں میں زیر تربیت ہیں سعودی حکومت کی مدد سے اتنے منڈ زجمع ہو گئے ہیں کہ ان ڈیفنس کے اداروں کے نئے پیمانہ پر تشکیل ہو سکے۔

﴿☆﴾

پاکستان کا ثقافتی ورثہ

پاکستان کا ثقافتی ورثہ بڑی حد تک اسلامی نوعیت کا حامل ہے لیکن اس میں برصغیر کی قبل از اسلام والی روایات بھی شامل ہیں۔ یہ سرزمین کثیر نسلی حملہ آوروں کے لئے راستہ کا کام انجام دیتی رہی ہے۔ اور اس کو مغرب اور مشرق کے درمیان "باب الداخلہ" کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آریہ، ایرانی، یونانی، عرب، ترک، مغل، افغان اور برطانوی لوگ ایک کے بعد ایک باقاعدہ طور پر اس سرزمین میں داخل ہوتے رہے اور اپنے اثرات چھوڑتے گئے۔ اس اثرات کے امتزاج سے مختلف قسم کے مذاہب، زبانیں اور رسم و رواج کی آمیزش عمل میں آئی اور یہی ہماری ثقافت کے اجزاء یا عوامل بنے جن سے ہماری تہذیب بھی متاثر ہوئی اور یہ دونوں شانہ بہ شانہ فراغ پاتے رہے (یعنی ثقافت اور تہذیب)۔ اس طرح ہماری ثقافت کئی ثقافتوں کا مجموعہ ہے جو مختلف نوعیت کے خیالات کی ہم آہنگی اور اشتراک سے ارتقاء کی منزلیں طے کر کے اپنی موجودہ شکل و صورت اختیار کر گئے ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

سوان ثقافت: جب تک ہم راولپنڈی کے قریب واقع وادی سوان کی ثقافت کا ذکر نہیں کرتے جو پوٹھوہار کے علاقے میں واقع ہے تب تک پاکستان کی ثقافت کی صحیح تصور پیش کرنا مشکل ہے۔ غالباً یہ ثقافت پانچ لاکھ سال پرانی ہے۔ یہ پتھر کے دور کے انسانوں نے اپنے اوزار اور آلات اس قدر یکساں نوعیت کے بنائے تھے کہ ہم اس بات میں حق بجانب ہیں کہ اس دور کو ایک ثقافت کے طور پر پرکھیں جسے سوان ثقافت کا نام دیا گیا ہے۔

سرخ اور بھوری ثقافتیں: جب ان علاقوں کے ماقبل تاریخ ٹیلوں کی کھدائی کی گئی اور احتیاط کے ساتھ تہہ بہ تہہ برآمد ہونے والی اشیاء کی درجہ بندی کی گئی تو دو اہم نوعیت کی ثقافتوں کا پتہ چلتا ہے اور رنگ کی مناسبت سے ان ماقبل تاریخ ادوار کی ثقافتوں کو ہم سرخ ثقافت اور بھوری ثقافت کے نام دیتے ہیں۔ سرخ ثقافت کو عام طور پر ژوب ثقافت کہتے ہیں جس کا تعلق شمالی بلوچستان سے ہے جب کہ بھوری ثقافت کوئٹہ، امری نال اور کلی ثقافتوں کا مجموعہ ہے جن کا جنوبی بلوچستان اور سندھ کے علاقے سے تعلق ہے۔

کچھ امری نال کے دیہات یا چھوٹے شہروں کی فصیلیں پتھروں کی دیواروں پر مشتمل ہیں جو دفاعی اغراض کے لئے بنائی گئی تھیں اور ان علاقوں کے گھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ نال کے علاقے میں ایک 100 قبروں پر مشتمل وسیع قبرستان موجود ہے جو اس ثقافت کا ترجمان ہے۔ اس مشترکہ ثقافت کی اہم بات یہ ہے کہ امری اور دوسرے مقامات پر جو ثقافت نظر آتی ہے وہ واضح طور پر وادی کی تہذیب سے ادنی درجہ کی ہے جب کہ نال میں پائی گئی مہریں اور تانبے کے اوزار اور دو سرے کئی قسم کے بتوں کے نقش و نگار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان دونوں ثقافتوں کے درمیان اختلاط کا مظہر ہیں۔ یہ ثقافت غالباً ایک ایسے مقامی معاشرے سے تعلق رکھتی ہے جس نے وادی سندھ کی تہذیب کے ارتقاء کے لئے ماحول فراہم کیا۔

کوٹ ڈیجی: صوبہ سندھ کا ماقبل تاریخ مقام کوٹ ڈیجی جو قومی شاہراہ پر خیر پور سے 24 کلومیٹر جنوب میں واقع ہے وہاں سے جو اعلیٰ قسم کی معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی مدد سے اس کہانی کی تشکیل میں مدد ملتی ہے کہ یہاں کی تہذیب کا تعلق 2800 ق م سے 2500 ق م کے درمیانی عرصہ سے ہے۔ یہاں پر ایک شہری ثقافتی عنصر کا پتہ چلا ہے جس کا تعلق قبل ہڑپہ کے دور سے رہا ہے۔ (12) کوٹ ڈیجی کے کھنڈرات دو حصوں پر مشتمل ہیں ایک تو اس کا قلعہ والا علاقہ ہے اور دوسرا اصل شہر کا علاقہ ہے قلعہ کے اطراف ایک اونچی چوڑی دفاعی فصیل ہے۔ قلعہ کے اندر بڑے بڑے وسیع کمرے ہیں جن کی بنیادیں پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور اوپر کی عمارے مٹی کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ یہاں سے جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں ان میں مٹی کے برتن تھالے، ذخیرہ کرنے کے مرتبان، بچوں کی کھلونا گاڑیاں، گیندیں اور گولیاں، کانسی کے تیروں کے سرے اور اعلیٰ بناوٹ والے پتھروں کے اوزار شامل ہیں۔

Lecturer SHAIKH ASIF IQBAL ZAHOORI

وادی سندھ کی تہذیب: قدیم دور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرت موئنجو دڑو (مردوں کا ٹیلہ) لاڑکانہ ضلع (سندھ) اور ہڑپہ ضلع ساہیوال (پنجاب) میں 2500 قبل مسیح تا 1500 قبل مسیح تک خوب پھل پھول رہی تھی۔ یہ شہر ایک دوسرے سے تقریباً 650 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں لیکن ان دونوں شہروں سے ملنے والے ثقافتی آثار کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ ان دو شہروں کے لوگ اپنے دور کی صنعتی اور تجارتی روایات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ یہ شہر غیر منظم اور بے قاعدہ طور پر آباد نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں بڑی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کے ساتھ تعمیر کیا گیا تھا جس سے ان کی شہری منصوبہ بندی کا پتہ چلتا ہے اور ان کے آرائشی ذوق کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس تہذیب کی یکسانیت کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ ان میں اوزان اور پیمائش کے ایک جیسے نظام فن و حرفت کی مشترکہ روایات ایک جیسے معاشرتی مقاصد اور نظریات مذہبی عقائد اور رسومات اور تصویری تحریر کا نظام پایا جاتا تھا۔ اور شاید ان کی زبان بھی ایک تھی۔ اس تہذیب کی بہت ساری امتیازی خصوصیات بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس زمانہ میں سندھ اور پنجاب میں اہپاشی سے سیراب شدہ زرعی زمینیں تھیں جن میں کثرت سے فصلیں اگائی جاتی تھیں جن سے فاضل اناج اور کپاس پیدا ہوتی تھی جس سے دیہات اور گاؤں کی ضروریات کی تکمیل ہوتی تھی اور دریا کے کنارے کچھ بستیاں کافی فروغ پا رہی تھیں۔ سندھ میں مواصلاتی آمد و رفت کا نظام بڑا عمدہ تھا لمبے فاصلوں تک کشتی رانی ہوئی تھی اور پہیے والی گاڑیاں سے اشیاء کو دریائی مقامات (بندرگاہوں) تک پہنچایا جاتا تھا۔ اس بات کے بھی اشارات ملے ہیں کہ یہ تہذیب برصغیر کے تاریک اور بھی تہذیب یافتہ علاقوں میں بہت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ بیرونی دنیا سے زمینی راستوں سے اور ساتھ ہی ساتھ سمندری راستہ قدیم ایران اور میسوپاٹامیا (بغداد کی قدیم وادی) سے اس علاقے کے باشندوں کے تعلقات قائم تھے۔ آدمی اور سامان تجارت کاروانوں کی شکل میں بلوچستان کے راستے اندر لائے اور باہر بھیجے جاتے تھے اور ان علاقوں کے درمیان مستقل طور پر معلومات اور تعلیم کا تبادلہ ہوتا تھا۔

آریائی تہذیب: 1500 ق م کے لگ بھگ آریہ نسل کے لوگ اس علاقہ میں جس کو اب پنجاب کہتے ہیں داخل ہوئے اور انہوں نے اسے "سپت سندھو" (سات دریاؤں کی سرزمین، سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج اور گھاگھرا) کا نام دیا۔ انہوں نے ایک چرواہوں کا معاشرہ تشکیل دیا جو بعد میں رگ ویدی تہذیب بنا۔ رگ وید (ہندوؤں کی مقدس کتاب) میں اس علاقے کی بڑی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے جس کو وہ "خدا کی بنائی" سرزمین قرار دیتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جب تک سپت سندھو کا علاقہ آریہ تہذیب کی آماجگاہ رہا اس میں ذات پات کے نظام کی ابتداء نہیں ہوئی۔ ذات پات کی تشکیل اور پیچیدہ قسم کی قربانیوں کی رسومات کی تشکیل گنگا کی وادی میں ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وادی سندھ کی تہذ ب سے آریہ تہذیب کو کافی استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

گندھارا ثقافت: راولپنڈی سے پشاور تک پھیلا وہ علاقے جس کو قدیم زمانے میں گندھارا کہا جاتا تھا یہاں دنیا کی ایک نے انتہا اولین تہذیب نے جنم لیا۔ گندھارا ایک نیم آزاد مملکت تھی جو تیسری صدی قبل مسیح میں پورے عروج پر تھی اور پانچویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس علاقے پر ایران کی اخامنشی نسل کے لوگوں نے چھٹی صدی قبل مسیح میں حملہ کیا تھا اور اسکندر اعظم نے چوتھی صدی قبل مسیح میں فتح کیا تھا۔ اس علاقے پر موریا خاندان، یونانی، ساکا اور پارتھیون نے حکومت کی۔ ٹیکسلا، دیر، سوات اور پشاور اس کے بڑے شہر تھے اور اہم ثقافتی مراکز تھے۔ گندھارا کی قبری ثقافت جو دیر اور سوات میں دریافت ہوئی اس سے پاکستان کی ثقافتی تاریخ پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے یہ وہ دور تھا جن وادی سندھ کی تہذیب ختم ہو چکی تھی جو غالباً 1500 ق م کا واقعہ ہے۔ اس وقت سے شروع ہو کر گندھارا کی تہذیب چھٹی صدی ق م تک جاری رہی اس کے بعد اخامنشی ایرانی قوم کا تاریخی زمانہ شروع ہوا۔ ہندو دیو مالا اور سنسکرت ادب کی روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ کو آریہ نسل کے لوگوں نے تباہ کیا لیکن حقیقت کیا تھی یہ ایک معمہ ہے جو شاید کبھی حل نہ ہو سکے۔

گندھارا کی قبری ثقافت دو تاریخی ادوار کے ثقافت کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ ایک کا تعلق کانسی کے دور سے ہے اور دوسرے کا تعلق فولاد کے دور سے ہے۔ اس ثقافت اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے ایک مخصوص قسم کی طرز معاشرت کا پتہ چلتا ہے جو جو گندھارا کے علاقے کے پہاڑی حصوں میں موجود تھی اور جن کا ثبوت اس علاقہ میں پائی جانے والی قبروں سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ ثقافت وادی سندھ کی ثقافت سے مختلف تھی اور اس کا بلوچستانی دیہاتی ثقافت سے بہت ہی تھوڑا تعلق تھا۔

چھٹی صدی ق م میں گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کی ابتداء کی۔ ٹیکسلا جو راولپنڈی سے قریب ہے بدھ مت کی تعلیم کا ایک ہزار سال تک مشہور مرکز رہا اور سارے ایشیا سے لوگ کھنچ کھنچ کر اس کی طرف آتے تھے۔ درحقیقت پورا شمال مغربی پاکستان خاص طور پر وادی سوات اور وادی پشاور گندھارا تہذیب کے مرکز بن گئے۔ ان علاقوں کے علاوہ بھی سارے پاکستان میں بدھ مت ثقافت خوب پھلی پھولی۔

گندھارا آرٹ: یہ آرٹ پاکستان کے لئے سرمایہ افتخار ہے جو عرصہ 500 سال تک یہاں پروان چڑھتا رہا (پہلی تا پانچویں صدی عیسوی)۔ اس کا گڑھ وادی پشاور اور اس سے ملحقہ سوات، بنیر اور باجور کے پہاڑی علاقے تھے۔ اس آرٹ سے علاقے کی ثقافتی نشاۃ الثانیہ کے ایک علیحدہ دور کا پتہ چلتا ہے۔ اس آرٹ میں ہندوستانی، بدھ مت

یونانی اور رومی مجسمہ سازی کا امتزاج نظر آتا ہے۔ گندھارا آرٹ کو اس کے ابتدائی زمانے میں کنشک خاندان کے حکمران کشان کی سرپرستی حاصل تھی جس کے عہد حکومت میں شاہراہِ ریشم پشاور وادی سندھ سے ہو کر گزرتی تھی اور اس علاقے کو بڑی خوش حالی نصیب تھی۔

اس ثقافتی ترقی کو 460ء میں سفید ہن کے حملے سے سخت دھچکا لگا اور بدھ مت کی ثقافت کو پاکستان میں بڑے زوال سے دوچار ہونا پڑا۔ ہندو مذہب کی جڑیں دوبارہ مضبوط ہو گئیں اور ہندو راجاؤں کی مشترکہ افواج نے ہن کو 528ء میں شکست دی۔ ہندوؤں کے اثر و رسوخ کو شمالی وسطی ہندوستان سے لے کر زیادہ سے زیادہ پاکستانی علاقے میں پھیلنے کا موقع مل گیا جہاں چوتھی صدی میں ایک ہندو خاندان کی گپتا شہنشاہیت ابھری اور یہ چھٹی صدری کے ابتدائی زمانے تک قائم رہی۔ ساتویں صدر میں آخری عظیم راجہ ہرش کی ہندوستان میں حکومت قائم ہوئی۔ ہرش کا 647ء میں انتقال ہوا وہ بڑا وسیع النظر اور روادار قسم کا راجہ تھا۔ اس کے زمانے میں چینی بھکشو ہوانگ سانگ برصغیر آیا اور اس نے اپنے سولہ سال تک کے سفر کے دوران جو کچھ دیکھا اسے اپنے سفر نامہ میں لکھا۔

اسلامی ثقافت: ... ست کی ثقافت موجودہ پاکستانی علاقہ میں اشوک کے زمانے یعنی تیسری صدی ق م تک کافی عروج پر تھی اور اس حالت میں پانچویں صدیوں تک جاری رہی۔ جب مسلمان شمالی پاکستان کے علاقے میں آئے اور تین صدیوں تک وہ جنوبی پاکستان کے علاقے میں آباد رہے اور ترقی کرتے رہے جس کو انہوں نے 712ء میں فتح کیا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنا مخصوص اور واضح فلسفہ زندگی لے کر آیا جو وحدت خدا اور سادہ طرز زندگی کی تعلیم کو پیش کرتا ہے اور اس میں ایک قسم کی غیر مصالحتی خصوصیت پائی جاتی ہے مگر پھر بھی اس میں بہت ساری ثقافتی تبدیلیوں کی گنجائش تھی جو آج تک ہم میں موجود ہیں اور ہماری موسیقی، شاعیر، فن تعمیر، لباس، زیورات، تہوار، طور طریقے، رسم و رواج اور سب سے زیادہ زبان پر ان کے اثرات مرتب ہوئے جو پاکستانی ثقافت کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ قومی زبان اردو اور مقامی زبانیں پنجابی، سندھی، بلوچی (بروہی اس میں شامل نہیں) بنیادی طور پر آریاؤں کی زبانیں ہیں جو مقامی یا عوامی زبان کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک استعمال سے ان میں عربی اور فارسی کے الفاظ اور خیالات سمو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی آمد کے باوجود ثقافت کا بہاؤ بلا کسی رکاوٹ آج تک جاری ہے۔ ان تقریباً ہزار سالوں میں ایک نئی قسم کی زندگی پروان چڑھی جس میں عربوں اور اس سے زیادہ ایرانیوں کی ثقافتیں گھل مل گئیں پھر بھی اس کی تشکیل ایک یگانہ مقامی نوعیت کی ہے جس میں درآمد شدہ خیالات اور طور طریقے شامل ہو گئے ہیں اور اس طرح یہ ہماری آج کی پاکستانی ثقافت بن گئی ہے۔

الکتاب اسٹیشنرز

ہمارے یہاں تمام اسکولز و کالجز کی درسی کتابیں اور ہمسفر پروڈکٹ کے تمام آئیٹم (کاپیاں، رجسٹر، نوٹ بکس) اور اقراء علی سیریز ماسٹر گائیڈز بازار سے بارعایت دستیاب ہیں۔

نیز اسکے علاوہ تمام اداروں کی گائیڈز، حل شدہ اور غیر حل شدہ پرچہ جات، مذہبی، معلوماتی ڈائجسٹ، رسائل، آفس اسٹیشنری، اسکول اسٹیشنری، سالانہ ڈائری، تہنیتی (Greetings) کارڈز دستیاب ہیں۔

(الکتاب اسٹیشنرز، مین روڈ لطیف آباد نمبر ۷ حیدر آباد)

فون: 022-3860215، 0321-3070857، 0321-3023225، 0321-3085617

الکتاب اسٹیشنرز

ہمارے یہاں تمام اسکولز و کالجز کی درسی کتابیں اور ہمسفر پروڈکٹ کے تمام آئیٹم (کاپیاں، رجسٹر، نوٹ بکس) اور اقراء علی سیریز ماسٹر گائیڈز بازار سے بارعایت دستیاب ہیں۔ نیز اسکے علاوہ تمام اداروں کی گائیڈز حل شدہ اور غیر حل شدہ پرچہ جات، مذہبی، معلوماتی ڈائجسٹ، رسائل، آفس اسٹیشنری، اسکول اسٹیشنری، سالانہ ڈائری، تہنیتی (Greetings) کارڈز دستیاب ہیں۔

(الکتاب اسٹیشنرز، مین روڈ لطیف آباد نمبر ۷ حیدرآباد)

فون: 022-3860215، 0321-3070857، 0321-3023225، 0321-3085617

یہ نوٹس درج ذیل مقامات پر باآسانی دستیاب ہیں۔

☆ گورنمنٹ ڈگری کالج و پوسٹ گریجویٹ سینٹر لطیف آباد نمبر ۱۱ حیدرآباد 03332653460

☆ الکتاب بک ڈپو اینڈ اسٹیشنرز لطیف آباد نمبر ۷ حیدرآباد 022-3860215

☆ اسٹوڈنٹس ان لطیف آباد نمبر ۲ حیدرآباد

☆ سیفی کالج لطیف آباد نمبر ۲ حیدرآباد 034587662033

☆ یونیورسل بک ڈپو حیدرآباد

☆ داتا فوٹو اسٹیٹ، لطیف آباد نمبر ۸

☆ برائٹ فوٹو اسٹیٹ، لطیف آباد نمبر 6

☆ ایلیگنٹ بک ڈپو لطیف آباد نمبر ۸ حیدرآباد

☆ گورنمنٹ زبیدہ گرلز کالج جیل روڈ حیدرآباد 03453572383

☆ علی فوٹو اسٹیٹ گاڑی کھاتہ حیدرآباد 0345-3636980

☆ اسٹوڈنٹس ان صدر کینٹ حیدرآباد

☆ سیفی کالج صدر کینٹ حیدرآباد

☆ سید برادرس فوٹو اسٹیٹ لطیف آباد نمبر ۱۰

☆ برائٹ فوٹو اسٹیٹ، لطیف آباد نمبر ۸

☆ پرنس فوٹو اسٹیٹ لطیف آباد نمبر ۸ حیدرآباد

☆ A-Z بک ڈپو لطیف آباد نمبر ۶ حیدرآباد

☆ سی فوٹو اسٹیٹ کورٹ روڈ حیدرآباد

☆ الشیخ بک ڈپو اینڈ لائبریری لطیف آباد نمبر ۸ (0333-2608956)

☆ رضوان بک ڈپو سرے گھاٹ چوک حیدرآباد

☆ اعظم بک ڈپو تلک چاڑی حیدرآباد

☆ مسلم بک ڈپو مارکیٹ حیدرآباد

☆ زبیر بک ڈپو لطیف آباد نمبر ۵ حیدرآباد

☆ المنصور بک ڈپو لطیف آباد نمبر ۵ حیدرآباد

☆ ایاز بک ڈپو حیدرآباد لطیف آباد نمبر ۱۱

☆ صبا بک ڈپو لطیف آباد نمبر ۱۱ حیدرآبا

This Book is available in Urdu & English Languages (Sindhi Version Coming Soon)

Rs. 150/=